قحطِ بنگال کا آشوب اور اردو شاعری

فیض الدین احمد*

برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں بنگال نے جتنی قدرتی آفات و سانحات کا سامنا کیا، غالباً اس کی نظیر ہندوستان کے کسی دوسرے علاقے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بیسویں صدی میں تقسیم سے قبل بنگال کو جس عظیم سانحے سے گزرنا پڑا اسے ''قحطِ بنگال'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بنگال کے افراد جس بنگال کو ''شونا دیش'' یعنی ''سونے کا ملک'' کہتے ہیں، واقعی اس کی زمین سونا اگلتی ہے۔ یہ دریاؤں کی لائی ہوئی زرخیز مٹی ہے جس کی ہر سال تجدید ہوتی رہتی ہے۔ ہر سال ۶ کروڑ مکعب فٹ مٹی ہمالیائی وادی سے یہاں آتی ہے۔

اس مٹی میں پوٹاش، فاسفورس ایسڈ، مختلف تناسب میں چونا، نائٹروجن اور دیگر اہم organic اجزا شامل ہوتے ہیں۔ دریاؤں اور مون سون کی ہواؤں کے دیس کا نام آتے ہی یہاں کی آب و ہوا کا مفہوم خود بہ خود ذہن میں آجاتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا متغیر، ہمالیائی سلسلے کے شمالی مشرقی زاویے کے درمیان بخارات سے لائی خلیجی ہوائیں سال بھر ملک کے بیش تر حصے کو بادِ باراں کی لپیٹ میں لیے رکھتی ہیں جو کبھی کبھی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ ملک میں اوسطاً ۱۸۰ انچ تک بارش ہوتی ہے۔

اپریل تا ستمبر کا درمیانی عرصہ بنگال میں فصلوں کی پیداوار اور حادثات کے وقوع پذیر ہونے کا ہوتا ہے۔ اس دوران چاول کی تین تین فصلیں اگانے والے وسیع و عریض کھیت کے ساتھ سیلاب کا خطرہ بھی منڈلاتا رہتا ہے۔ قدرت نے اگر بنگال کو سنہرا ریشہ یعنی جوٹ نہ دیا ہوتا تو یہاں کی معاشی قحطوں کی تلافی ممکن نہ تھی۔ دھان اور جوٹ کی کثیر پیداوار کے علاوہ سرسوں، السی، چنا اور دالیں بھی یہاں کافی مقدار میں ہوتی ہیں۔ سلہٹ میں چائے کے بڑے بڑے باغات اور گنے کی فصلیں یہاں کی معیشت کو سہارا دیتی ہیں۔ پان کے باغات اور سپاری کے پیڑوں کی قطاریں پورے صوبے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن کی درآمد سے وافر زرِ مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ یہاں کی زرعی، حیوانی اور جنگلاتی پیداوار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قدرت کا دیا ہوا یہاں بہت کچھ ہے لیکن یہاں کے باشندوں کی فلاح اور آسودگی کے لیے جو تدابیر اختیار کی جانی چاہیے تھیں وہ موقوف ہے[۱]۔

* استاد، کراچی گرامر اسکول

تاریخ کے ہر دور میں ملک کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جنھوں نے اس خطے کو خوب لُوٹا لیکن عوام کی فلاح و بہبود کے لیے، خصوصاً قدرتی آفات سے بچاؤ کی کوئی مناسب تدبیر اختیار نہ کی جا سکی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی استعمار نے ہندستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص جو ظلم کے پہاڑ توڑے، اب وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ فرنگی نو واردوں نے تجارت کے روپ میں جو مظالم ڈھائے، امن و سکون کو جس طرح برباد کیا، دولت و ثروت جس انداز سے لُوٹا اور یہاں کے لوگوں کی آزادی کو جس دھاندلی اور فریب کاری سے سلب کیا، اِس کا اظہار خود اِن ہی کے ہم قوم اینی بیسنٹ (Annie Besant) نے بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ فرینکوئس برنیر (François Bernier) کے مطابق فرنگی تاجروں نے پاک و ہند میں بہنے والی سیم وزر کی ندی سے اپنے جیب داماں کی جس طرح تزئین کی، اپنے قصرِ ایوانوں کو جس طرح نکھارا اور اپنی تجوریوں کو جس طرح لب ریز کر دیا، وہ مکر و فریب اور ظلم و ناانصافی کی نہ بھولنے والی داستان ہے۔

برطانوی قوم نے تجارت کو ڈھال بنا کر برعظیم پاک و ہند پر اپنا تسلط قائم کیا اور ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے نہ صرف جسموں کو پابہ زنجیر کیا بلکہ ذہنوں کو بھی مستجر کر دینے کی مہم چلائی [۲]۔ سترھویں صدی کے آغاز میں سر تھامس رو (Thomas Roe) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کو سطحِ سمندر پر مضبوطی سے قدم جمانے کا جو مشورہ دیا تھا اُس پر تیزی سے عمل درآمد ہوا۔ اِسی کاوش کا نتیجہ تھا کہ اِس صدی کے اختتام پر انگریزوں نے نہ صرف بحری برتری حاصل کر لی بلکہ اہم بندرگاہوں پر قلعے اور فیکٹری کی صورت میں اپنے مضبوط مورچے بھی حاصل کر لیے۔ بمبئی، مدراس، سورت اور ہگلی جیسے ساحلوں پر دست رس حاصل کر کے انھوں نے صحیح معنوں میں برعظیم کا گھیرا تنگ کر دیا۔ بالآخر ۱۶۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُس وقت کے صدر اور بمبئی کے گورنر جیرائڈ اونجیر (Gerald Aungier) نے لندن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سامنے ایک مراسلے کے ذریعے لکھا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ایک ہاتھ میں تجارتی سامان اور دوسرے میں تلوار ہو'' [۳]۔ اِس کے بعد فوجی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر برعظیم میں مضبوط اور مستحکم برطانوی حکومت کے قیام پر منتج ہوا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں تو شائستہ خان کی شدید مزاحمت نے انگریزوں کے چھکّے چھڑا دیے تھے لیکن ان کی موت کے بعد کوئی جانشین ایسا نہیں تھا جو آنے والے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لہٰذا برطانوی جارحیت کا پہلا نشانہ بنگال ہی بنا۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ایک سازش کے تحت سراج الدولہ کو شہید کر دیا گیا۔

اِسی سال کو دراصل کمپنی کے استحکام کا پہلا سال قرار دیا جا سکتا ہے [۴]۔ رابرٹ کلائیو (Robert Clive) سے لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie) تک کمپنی کے توڑ جوڑ سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کسی نہ کسی بہانے سارے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتے تھے جس کی ابتدا جنگِ پلاسی سے ہوئی اور انتہا بکسر کی لڑائی پر ہوئی۔ انگریزوں کی ان محاذ آرائیوں کے خلاف راجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے دلوں میں شدید نفرت پھیل رہی تھی۔ ڈلہوزی کی بدعنوانیوں نے اِسے شدید تر کر دیا۔ معاشی استیصال کی حالت یہ تھی کہ کمپنی نے دیسی صنعت کو بالکل تباہ کر دیا۔ تجارت کساد بازاری کا شکار تھی اور

کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی[۵]۔ اپنی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے ظلم کی انتہا یہ کی جاتی تھی کہ کاری گروں اور دست کاروں کے انگوٹھے تک کاٹ دیے جاتے تھے۔ جوش ملیح آبادیؔ نے اِن ہی مظالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے جوانوں سے خطاب میں کہا تھا کہ:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو　　دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر　　نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں پہ آئے تھے سوداگری کے واسطے　　نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی　　سچ بتاؤ کہ وہ کیا انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے　　کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے
لُوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں　　سربرہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم　　سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعت ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی　　موت بھی کیسی تمھارے ہات کی لائی ہوئی
اللہ اللہ! کس قدر انصاف کے طالب ہو آج؟　　میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج[۶]

انگریزی راج میں کلکتے کو ترقی تو بہت ملی لیکن عام لوگوں کی حالت پھر بھی نہ بدلی۔ قیامِ پاکستان کے زمانے تک صرف کلکتے میں تقریباً ۹۰۰ کے قریب مختلف قسم کے کارخانے قائم ہو چکے تھے اور اُن میں کام کرنے والوں مزدوروں کی ایک بڑی جماعت ملک کے دور دراز علاقوں سے یہاں آ کر آباد ہو رہی تھی۔ اِسی لیے آبادی کا دباؤ بھی اس شہر پر بہت زیادہ تھا۔ مشرقی بنگال میں عوام کی غربت ناقابلِ دیدنی تھی۔ کسانوں کی حالت بھی ابتر تھی۔ گاؤں میں ایک آدھ ہی ایسے کسان ملتے جن کے پاس ایک بیگھا سے اوپر زمین ہو۔ زمینوں پر قبضہ ہندو سیٹھوں اور ساہوکاروں کا ہوتا۔ بیش تر افراد سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور دکھائی دیتے تھے۔ اکثر علاقے غذائی قلت کا شکار رہتے اور اس کمی کو وہ لوگ ''ساگو'' اور ''ڈیپ'' جیسی پانی کی اشیا سے پورا کرتے[۷]۔

اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلی تین صدیوں میں بنگال کو چھوٹے بڑے کئی قحطوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷۷۰ء میں قحط کا شکار ہو کر مرنے والوں کی تعداد دس ملین تک بتائی جاتی ہے[۸]۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والے اکثر محققین نے بھی قحطوں کے دوران لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہلاکتوں کی تصدیق کی ہے۔ *World History Association* کی جانب سے ۲۰۰۲ء میں بُک پرائز حاصل کرنے والے مائیک ڈیوائس (Mike Davis) کا کہنا ہے کہ برطانوی راج کے دوران ۱۵ ملین انسانوں کی نسل کشی کی گئی۔ اپنی تصنیف *Famines and the Making of the third Late Victorians Holicaust: El Nino World* میں ہندوستان کی معاشی تاریخ کا

مطالعہ پیش کرتے ہوئے نوآبادیاتی دور کی بدنظمی، قحط کی صورتِ حال اور اس کی وجوہات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اس نے لاکھوں ہلاکتوں کی وجہ برطانوی دور کی معاشی بدنظمی کو قرار دیا ہے۔ نیال فرگوسن (Niall Ferguson) نے اس امریکی مصنف کے تجزیے کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی[۹] مگر اس کتاب کے اکثر تبصرہ نگاروں اور نقادوں نے لکھا کہ ڈیوس کی باتوں سے کُلی اختلاف ممکن نہیں۔ سکھ دیو سندھو (Sandhu Sukhdev) نے ایک جگہ معروف جریدے *The Guardian* میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد معیشت اور فری مارکیٹ ایکونومی کے مطالعے کے ضمن میں برطانوی استعمار کے کردار پر ایک بہترین کتاب قرار دیا ہے[۱۰]۔ ڈیوس کا کہنا تھا کہ:

> A new dark age of colonial war, indentured labour, concentration camps, genocide, forced migration, famine and diseases[11].

اس معاشی قتل کی متعدد مثالیں تاریخ کے اوراق میں بھری پڑی ہیں۔ بندوبست دوامی (Permanent Settlement) کے قانون نے مزید لوگوں کو دست نگر بنا دیا تھا۔ مختلف قسم کے ناجائز ٹیکس کی وصولی نہ ملنے کی صورت میں مار پیٹ اور قید میں ڈالنا عام سی بات تھی۔ انگریز اور اس کے گماشتے بازار کے عام نرخ سے کم نرخ پر پیداوار خریدنے، طلب و رسد میں بحران پیدا کر کے اُن ہی اشیا کی زیادہ قیمت وصول کرتے۔ اِن گماشتوں کے خوف سے نقل مکانی بھی زیادہ ہوتی۔ علاقے کے علاقے ویران ہو جاتے۔ جب قحط کی صورتِ حال پیدا ہوتی تو ہزاروں لاکھوں لوگ مر جاتے۔ تنگ آ کر لوگ اپنے بچوں کو فروخت کرتے۔ لوگ بھوک سے بلبلا کر ہلاک ہو جاتے لیکن انگریز اور اُن کے گماشتے چاول اور گندم کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے[۱۲]۔ بات بات پر جرمانے لگانا، زیادتیاں کرنا، یہاں تک کہ مسلمانوں کی داڑھی پر ٹیکس جیسے معاملات سے کمپنی کی مجرمانہ ہٹ دھرمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[۱۳]۔ قحط اور اس طرح کی دیگر قدرتی آفات کے موقعے پر کمپنی کے افسروں کو امیر بننے کے زیادہ مواقع ملتے۔ چاول جو عام حالات میں ایک روپے میں ۱۲۰ سیر ملتا تھا، قحط کے دوران ایک روپے میں صرف تین سیر کے نرخ پر آ جاتا۔ ایک جونیر افسر ۶۰،۰۰۰ تک کی رقم قحط کے دوران کما لیتا۔ مغلوں کے زمانے میں قحط کے دوران لگان کم ہو جاتا مگر کمپنی کے اہل کار لگان بڑھا دیتے۔ وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کے مطابق صرف ۱۷۷۰ء کے قحط میں ایک کروڑ افراد بھوک سے ہلاک ہوئے جو کل آبادی کا ایک تہائی تھے۔ لوگ روٹی کے بدلے بچے بیچتے۔ اِسی طرح ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء ستر لاکھ افراد قحط کی وجہ سے لقمۂ اجل بنے[۱۴]۔ کمپنی کی پالیسی کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں مقامی صنعتوں کو پنپنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جبراً نیل (Indego) کاشت کرائی جاتی جس کے بدلے اپنی مرضی کا محنتانہ مقرر کیا جاتا۔ کسان اپنی مرضی سے منافع بخش فصل کاشت نہیں کر سکتے تھے اور دوسری مثال یہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد پورے بنگلا دیش میں خصوصاً ڈھاکا کی کپڑے کی صنعت کو بے رحمی سے تباہ کر دیا گیا۔ جولاہے اس جبر کا پوری طرح نشانہ بنے ابتداً ان کے بہترین کپڑے کا من مانا نرخ متعین کر کے زبردستی خرید لیا جاتا۔ فروخت نہ کر

نے پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ یہ وہی جولاہے تھے جن کے تیار کردہ ململ کا پوری دنیا میں چرچا تھا۔ اِن کی تیار کردہ ململ کا پورا تھان ایک مٹھی میں سما سکتا تھا لیکن کمپنی کو ان کے فن کی قدر کرنے کی کیوں فکر ہوتی۔ وہ تو مانچسٹر اور برمنگھم کے تیار کردہ کپڑے کی صنعت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ایسے حربے استعمال کیے جانے لگے جن سے مقامی صنعت کا پہیہ رک جائے مسلمان جولاہے جو بیک وقت کسان بھی تھے اور صنعت و حرفت میں بھی پیش قدمی دکھا رہے تھے، کمپنی کی طرف سے مقامی صنعت کی حوصلہ شکنی کے نتیجے میں زراعت تک محدود ہو کر رہ گئے۔ لاکھوں اہلِ حرفہ بے روزگار ہو گئے اور دیہات کا رخ کرنے لگے۔ جہاں بندوبست دوامی کے ہول ناک اثرات منھ پھاڑے کھڑے تھے۔ کمپنی کی اس پالیسی کے نتیجے میں مقامی کپڑے کی مانگ ۱۷۸۹ء سے مسلسل کم ہونا شروع ہو گئی۔ صرف ڈھاکا میں تیار ہونے والے کپڑوں کی برآمد جو ۱۷۹۹ء میں بارہ لاکھ مالیت تک سالانہ تھی، گر کر ۱۸۱۳ء میں محض ساڑھے تین لاکھ تک آ گئی۔ ۱۸۱۷ء میں تو ڈھاکا سے انگلینڈ برآمد کی جانے والی ململ بالکل ختم کر دی گئی اور ڈھاکا کی تجارتی کوٹھی (کمرشل ریزیڈنسی) کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا[۱۵]۔ کمپنی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایسے بہیمانہ طریقے اختیار کیے کہ پڑھ کر انسانیت شرمندہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگریزوں کی مرضی کے خلاف جولاہے کپڑے تیار کر کے مارکیٹ لاتے تو اُن کے ہاتھ یا انگوٹھے کاٹ دیے جاتے[۱۶] مذکورہ صفحات میں درج نظم ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب میں جوشؔ نے جو یہ مصرعہ کہا کہ ''دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تم'' دراصل کمپنی کے اِن ہی مظالم کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اِن اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت و حرفت میں تیزی سے ترقی کرتا یہ خطہ محض زراعت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۱۳ء میں تھامس منرو (Thomas Munroe) جو بعد میں گورنر مدارس بھی بنا، نے اعتراف کیا کہ یہاں کے تیار کردہ ململ انگلینڈ کے ململوں سے اچھے ہوتے تھے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر ہنری جارج ٹکّر (Tucker) نے ۱۸۲۳ء میں برطانوی ڈائریکٹر کو بڑے فخر سے لکھا کہ:

> India is reduced from the state of manufacturing to that of an agricultural country[۱۷].

ہندوستان کی صنعتی حیثیت گھٹا کر زرعی ملک بنا دینے پر فخریہ دعویٰ کمپنی کے ناپاک عزائم کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے معیشت پر بہت منفی نکلا۔ کپڑے کی صنعت کے سب سے بڑے مرکز ڈھاکا کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے گھٹ کر محض ۲۰ ہزار تک رہ گئی[۱۸]۔ ۱۸۶۶ء تک برطانوی نوآبادیاتی عہد میں قحط کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔ کپڑا سازی کی صنعت کی تباہی کے بعد زراعت ہی اہم آمدنی کا ذریعہ اور اس کا انحصار مون سون کی بارشوں پر ہونا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں اخبار ''انگلش مین'' نے پہلے ہی خبردار کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہوتے جا رہے ہیں جہاں اناج کی شدید قلت ہونے والی ہے۔ لیکن ایسی خبروں کی اشاعت کے باوجود نوآبادیاتی انتظامیہ نے قحط کے سدِ باب کے لیے کچھ نہیں کیا۔ قحط کے بعد ۱۸۶۶ء میں برطانوی گورنر سیسل بیڈن نے اپنے دورۂ اڑیسہ کے دوران واضح طور پر کہا کہ قدرت کے اِن کاموں کو روکنے یا اِن کا مداوا کرنے کے لیے کوئی حکومت کچھ نہیں کر سکتی[۱۹]۔ جب کہ مورخ این۔ کے۔ سنہا

کا کہنا تھا کہ انگریز حکومت ایک قحط سے شروع ہوئی تھی اور ختم بھی ایک عظیم قحط پر ہوئی۔ انھوں نے بتایا ۱۹۴۳ء میں پڑنے والا قحط دراصل اسی رجحان کا منطقی نتیجہ تھا جو ۱۷۷۱ء میں شروع ہوا تھا۔ اِن کے مطابق ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء، اور پھر ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۰ء کے مابین پڑنے والے بائیس قحط برطانوی اقتدار کی پیداوار تھے[۲۰]۔ ۱۸۶۶ء میں برطانوی حکام کے لیے تیزی سے پھیلتے ہوئے خوراک کے بحران اور اُس کے نتیجے میں پھیلنے والی تباہی و بربادی کو نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا اور کمپنی کے فوجی اور پولیس اہل کار بھی قحط اور بھوک سے مرنے لگے تو کلکتہ میں مقیم کمپنی کی انتظامیہ کو ہوش آیا۔ ایک مبصر نے لکھا کہ بنگال میں میلوں تک لوگوں کی ایک ہی پکار تھی کہ ''آپ کے پاس کھانے کو کچھ ہے''۔ خبریں جب کلکتہ اور لندن تک کے ایوانوں میں پہنچنے لگیں کہ ہزاروں لوگ روزانہ کی بنیاد پر مر رہے ہیں تو مسٹر بیڈ نے چاول کی بوریاں اڑیسہ روانہ کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن اس مجرمانہ سستی کی وجہ سے بھی ہزاروں ہلاکتیں ہوئیں۔ دیر سے فیصلہ کرنے کی وجہ سے مون سون کی بارشوں سے بھی دشواریاں پیدا کیں جن کی قیمت اڑیسہ والوں کو اجتماعی موت کی صورت میں دینی پڑی۔ بعد میں لمبے عرصے تک نوآبادیاتی انتظامیہ کو قحط کی بابت مختلف قسم کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا[۲۱]۔ برطانیہ کی قحط پالیسی کی تلخ و ترش تنقید میں، مقید دیکھنے والے بہ شمول ولیم ڈگبی (William Digby) کہتے ہیں کہ برطانیہ نے ۱۸۹۰ء کی دہائی کے قحطوں کی شدت میں اچھی خاصی مدد کی اور ایسا کرنے میں انھوں نے ایسے علاقوں کو آنے والی دہائیوں تک کے لیے معاشی جمود بلکہ سماجی انتشار کا شکار بننے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر بھی ہمارے کچھ مورخین قحطوں اور اکالوں کو محض عذاب الٰہی قرار دینے کی بھونڈی کوشش کرتے ہیں اور زمینوں کے بے پناہ کرایوں، ناقابلِ برداشت ٹیکسوں اور سود کی آسمان کو چھوتی شرحوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں سمجھتے۔

۱۸۹۸ء کمیشن کی سفارشوں جیسے قحط کے تدارک کے اقدامات کے لیے اس کے سر اتنے سہرے باندھے جاتے ہیں جتنے کہ یہ مستحق نہیں ہیں۔ اسی لیے کیمرج ہسٹری آف انڈیا کی چھٹی جلد ہمیں بتاتی ہے کہ تدارک کے اقدامات کی نگرانی خود کرزن نے بڑی توجہ اور دل چسپی سے کی اور جولائی کی شدید گرمی میں گجرات کے متاثرہ اضلاع کا بہ نفسِ نفیس دورہ کیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں بھوک سے ایک بھی موت واقع نہیں ہوئی تھی[۲۲] مگر ۱۸۹۰ء کی دہائی میں پڑنے والے قحطوں کا ذکر کرتے ہوئے ہندی شاعر بدری نرائن پریم گھن نے جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے انگریزوں کے دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بھاگورے بھاگو بھینکر اکال پڑا ہے بھارت پر تباہی کے کالے بادل گھر آئے ہیں

کاروبار ٹھپ، دھندے سب بند[۲۳] (انگریزی سے ترجمہ)

اِسی طرح ۱۹۴۳ء کے قحط کی بابت بھی مورخین کا یہی کہنا ہے کہ یہ قحط بھی خراب فصل کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریزوں کی غیر دانش مندانہ پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔ اِس قحط کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس زمانے کی بین الاقوامی سیاست

اور آپس میں برسرِ پیکار ممالک کی حربی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔

۱۸ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو انگریزوں نے ملایا میں پینانگ کی بندرگاہ خالی کر دی۔ پھر ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو انھوں نے ہانگ کانگ میں محض دو دن کی مزاحمت کے بعد جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جس سے کلکتے کے شہریوں میں خوف و ہراس کی ابتدا ہوئی۔ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ہوم ممبر ان کلکتے ہی میں موجود تھے۔ اِن کے حکم کے تحت ۲۶ دسمبر کو سرت چندر بوس کو کلکتہ جیل سے منتقل کر کے مدراس جیل بھجوا دیا گیا۔ وزیرِ اعلیٰ فضل الحق نے بوس کی مدراس جیل منتقلی کو ایک روز کے لیے ملتوی کروانے کی کوشش کی مگر ہوم ممبر نہیں مانا اور سرت چندر بوس کو فوراً مدراس پہنچا دیا گیا جب کہ اُس کا بھائی سو بھاش چندر بوس جاپانیوں کی امداد سے ہندوستان کو آزاد کروانے کی جدو جہد میں مصروف رہا[۲۴] تقریباً ایک برس سے زا ئد عرصے روپوشی کے بعد مارچ ۱۹۴۲ء میں برلن ریڈیو سے اِن کی تقریر نشر ہوئی تو تمام شبہات کا خاتمہ ہوا اور یہ بات واضح ہوئی کہ وہ جرمنی پہنچ چکے ہیں اور انگریزوں کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔ اِس دوران جاپان نے بھی ہندوستان پر انگریزو ں کے تسلط کے خلاف زور و شور سے پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔ جاپان اور جرمنی کے گٹھ جوڑ اور مسلسل پروپیگنڈے نے بڑ ی تعداد میں ہندوستانیوں کو متاثر کیا۔ اُنھیں یقین ہو گیا کہ جاپان دراصل ہندوستان کی آزادی اور ایشیا کے استحکام کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ اِن کا خیال تھا کہ جاپانی حملے نے انگریزوں کی طاقت پارہ پارہ کر دی ہے۔ اس عمل سے ہماری آزا دی کی تحریک کو بھی تقویت ملے گی۔ گاندھی کو بھی اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اتحادی یہ جنگ نہیں جیت سکیں گے بلکہ جاپان اور جرمنی کو فتح حاصل ہو گی۔ اس سے قبل گاندھی، سو بھاش چندر بوس کی بہت سی سرگرمیوں کی مخالفت کرتے رہتے تھے لیکن بوس کا جرمنی پہنچ کر آزادی کی جدو جہد میں کردار ادا کرنے سے گاندھی کے خیالات میں بھی تبدیلی آئی۔ بوس جو ایک مسلمان کے روپ میں داڑھی رکھ کر پشاور سے افغانستان اور پھر وہاں سے جرمنی پہنچے تھے پھر اُنھوں نے جاپان میں رہ کر وہاں موجود وہ ہندوستانی جو قید میں زندگی گزار رہے تھے کو مجتمع کر کے ہندوستان کی قومی فوج بنائی جس نے آسام کی حدود تک کارروائیوں میں حصّہ لیا۔ وہاں مسلمانوں کی بابت بھی اُن کے خیالات بدلے اور اُنھوں نے محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کو رام کیے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ اِسی لیے نیشنل آرمی میں موجود مسلمان سپاہیوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ بہت اچھا تھا اور سپاہی بھی اُن کے مداح تھے۔ گاندھی کے رویے میں تبدیلی کی وجہ بھی وہ عالمی حالات تھے جو بہت تیزی سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اتحادی جب پسپا ہو رہے تھے اور جاپان نے بیک چشم و زدن برما، ملایا، سنگاپور اور انڈونیشیا کے علاقو ں پر قبضہ کر لیا تو گاندھی کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب بوس ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن میں داخل ہو گا۔ لہٰذا انھوں نے بوس کی تعریف و تحسین شروع کر دی اور عدم تشدد کی آڑ لے کر اتحادیوں اور انگریزوں کی اخلاقی مدد تک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نہرو نے یہ حمایت جاری رکھی لیکن گاندھی نے بوس کی وجہ سے اپنے نظریے میں تبدیلی پیدا کی[۲۵]۔ ملکی سیاست کے نشیب و فراز اور عالمی حالات کے پیشِ نظر پوری دنیا اس وقت عالمی کساد بازاری کا شکار دکھائی

دیتی ہے۔

کلکتہ کے شہریوں میں بھی خوف و ہراس کی ایک بڑی وجہ عالمی حالات کے تناظر میں چاول کی قیمت میں ہوش رُبا اضافہ تھا جس کے اثرات بتدریج کلکتہ کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں صوبے میں چاول کے نرخ ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ۲۷ فیصد تک بڑھ چکے تھے۔ اِس سال پورے بنگال میں چاول کی کاشت ۷ لاکھ ۴ ہزار ٹن تک ہوئی تھی جب کہ صوبے کی ۶۰ء۳ ملین آبادی کو سال بھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دس لاکھ ۳۱ ہزار ٹن چاول کی ضرورت تھی۔ چناں چہ ۰۰۰، ۸۴، ۲ ٹن کمی پوری کرنے کے لیے حکومت نے ۰۰۰، ۲۳، ۳ ٹن چاول درآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ درآمد شدہ چاول کی بڑی مقدار کو برما سے ہندوستان آنا تھا جب کہ جنوبی ایشیا کے مختلف خطوں میں انگریزوں کی پسپائی اور ذلت آمیز شکست کے پیشِ نظر جاپانیوں کے تسلط میں چلے جانا، صاف نظر آ رہا تھا۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۴۲ء کو جاپانیوں نے رنگون پر پہلی بار بم باری کی تو کلکتہ میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ اِس کہرام میں شہر چھوڑ کر بھاگنے والوں میں اناج کے تھوک اور پرچون، بیوپاریوں کی بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ اِس صورتِ حال میں غذائی اجناس کی ترسیل میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ سپلائی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ صنعتی علاقوں میں اس سے سخت بے چینی پھیل گئی۔

حکومت نے مزدوروں کی بے چینی کے سدِ باب کے لیے کارخانے داروں سے اناج کی دکانیں کھلوائیں مگر شہر کی سراسیمگی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ کارخانے داروں نے ایمپلائر گرین شاپس کے لیے چاول کی خریداری شروع کی تو اس کی قیمت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اس اضافے کی ایک وجہ وہ افراط و تفریط بھی تھی جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ جلد یا بہ دیر جاپانی جہاز کلکتہ پر بم باری کرنے والے ہیں۔ ہندوستانی کو اب جنگ کی لپیٹ میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری کرنے والوں اور سٹے بازوں نے اس افراتفری سے خوب فائدہ اٹھایا اور اناج کے بھاؤ میں روز بہ روز اضافہ کرتے چلے گئے[۲۶]۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیاستِ ہند پر یورشِ جاپان کا براہِ راست اثر پڑا۔ اس سے قبل ہٹلر کے حملے اور فتوحات نے بھی انگریزوں کے ہوش اڑا رکھے تھے ابھی تک روس اور امریکا میدان میں نہیں کودے تھے۔ لہٰذا جرمنوں سے لڑنے کی ساری ذمہ داری بھی تن تنہا برطانیہ کے سر تھی۔ چرچل (Winston Churchill) بھی اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے جنونی ہٹلر سے کم نہیں تھا۔ اُس نے اپنی پوری توانائی جنگ کی تیاریوں میں جھونک دی۔ برطانیہ کی جنگی تیاریوں میں ہندوستان بھی حصّہ دار بنا۔ یہاں کی کثیر آبادی سے مرضی کے مطابق فوج، مزدور اور نفری بھرتی کی جا سکتی تھی۔ مرکزی حکومت نے بیسیوں نئے نئے محکمے، دفاتر، شعبہ جات اور شاخیں قائم کر کے لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانیوں کو بھرتی کر لیا تھا۔ معمولی پڑھے لکھے جنھیں عام حالات میں کوئی پوچھتا تک نہیں تھا، ہزاروں کی تعداد میں ملازم بنائے گئے۔ اب ان تمام لوگوں کی ضروریات، خام اجناس کی فراہمی اور جنگی ساز و سامان کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ کثیر تعداد میں دیہاتی شہر میں امڈ آئے۔ وسیع ہنگامی

انتظامات کے مصارف کے واسطے حکومت کو کاغذ کے روپے بنانے پڑے۔ مصنوعی سکّے نے زر کی قوت گھٹا دی۔ سونا چاند ی سمیٹ سمیٹ کر برطانیہ بھیجا گیا تا کہ امریکا سے سامان حرب کی خریداری ممکن بنائی جا سکے۔ اس طرح برطانیہ کی اقتصا دی حالت بھی پتلی ہوگئی اور ہندوستان بھی بے تحاشا قرض تلے دب گیا[۲۷]۔ اس اقتصادی بحران کے نتیجے میں جیسے جیسے اجنا س کی قیمتیں بڑھنا شروع ہوئیں، کلکتہ کے عام شہریوں کے لیے زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی گئی۔ اس صورتِ حال میں شہریوں کا انخلا بھی شروع ہوگیا۔ ایسی صورتِ حال میں ہندوستانی سیاست میں بھی تیز رفتار تبدیلی کے آثار دیکھے گئے۔ قائداعظم نے ۱۹۳۵ کے ایکٹ کے تحت اقتدار کی منتقلی کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کی جانب سے جاپانیوں کے خلاف بھر پور تعاون کا یقین دلایا جب کہ دوسری جانب فضل الحق کی وزارت کے مہاسبھائی وزیر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کے صوبۂ بہار کے شہر بھاگل پور میں خلافِ قانون اجتماع سے خطاب میں انگریزوں کے خلاف نہایت زہریلی تقریر کی جس کے نتیجے میں انھیں سر گوکل چند نارنگ اور رائے بہادر مہر چند کھنہ کے ساتھ ایک دن کے لیے گرفتار کر لیا گیا۔ فضل الحق کی حکومت بھی اس زبردست سیاسی اور اقتصادی بحران کے نتیجے میں کمزور ہو چکی تھی۔ اخبار اسٹیٹسمین (Statesman) نے فضل الحق کی وزارت کی برطرفی کا مطالبہ پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ۲۳/ مارچ کو جاپان نے انڈیمان پر قبضہ کر لیا۔ ۵ اور ۱۶ اپریل کو ہندوستان کے مشرقی ساحل کی بندرگاہ وزیگا پٹم اور لنکا پر بم باری کی اور خلیجِ بنگال میں انگریزوں کے تجارتی جہازوں پر بم باری کر کے بنگال کے بحری راستوں کو مسدود کر دیا تو فضل الحق حکومت اور بھی زیادہ غیر پسندیدہ ہوگئی۔ بوس برادران پہلے ہی جاپان کی مدد کر رہے تھے۔ کانگریس میں جاپان سے ہم دردی رکھنے والے اراکین کی کمی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال سے انگریزوں نے بنگال پر جاپانی حملے کے خطرے کے پیشِ نظر بوکھلاہٹ میں کچھ ایسے اقدام کیے جو قحط کا سبب بن گئے۔ کلکتہ کے ہنگا می حالات میں ہر طرف افراط و تفریط کا بازار گرم تھا۔ لوگوں کے انخلا کی وجہ سے ریل گاڑیوں، ٹرکوں، گاڑیوں، لاریوں اور بیل گاڑیوں میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چٹا گانگ، نواکھلی اور پترا کے اضلاع کی حالت بہت بری تھی۔ برما سے بھی ہر روز ہزاروں پناہ گزین بہ راستہ آسام اِن اضلاع میں پہنچ رہے تھے۔ چاروں طرف نفسانفسی اور دل خراش مناظر دکھائی دیتے تھے۔ اِس صورتِ حال میں برطانیہ کے اعلیٰ فوجی حکام نے بنگال کے ساحلی علاقوں میں ''انکار'' کی تباہ کن پالیسی اختیار کرتے ہوئے اپریل کے وسط تک مدنا پور، باقر گنج اور کھلنا کے اضلاع کے لوگوں کے پاس جو بھی فالتو ذخیرہ تھا، سرکاری کارندوں کے ذریعے زبردستی خرید لیا گیا۔ اس ظالمانہ اقدام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برما سے چاول کی فراہمی بند ہو چکی تھی اِس لیے کلکتے اور گردونواح میں مقیم افواج کے لیے اناج کی ضرورت، اِن اضلاع کے عوام کو اناج سے محروم کر کے پوری کی گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریز فوج کی رائے کے مطابق ساحلی علاقوں میں جاپانیوں کا قبضہ بعید از امکان نہیں تھا۔ اِس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اِن ساحلی علاقوں کا فالتو اناج جاپانیوں کے ہاتھ لگے۔ تاہم ان دونوں اقدامات کا نتیجہ بڑا منفی نکلا۔ اس اقدام سے بنگال کے ساحلی علاقوں میں اناج کی شدید قلت پیدا ہوگئی۔

صوبائی حکومت کے اس اعلان کے بعد فوجی ضرورتوں کے لیے علاقوں کو مختصر نوٹس پر جبراً خالی کرلیا جائے گا۔ اس اعلان سے مزید افراتفری پھیلی۔ ماہی گیروں کے مچھلیاں پکڑنے اور عوام کی نقل وحمل کی بندش سے بھی بے روزگاری بڑھی جس سے قحط کے آثار نظر آنے لگے۔ ۱۶/۱ کتوبر ۱۹۴۲ء سے صورتِ حال مزید ابتر ہونا شروع ہوگئی۔ ایک زبردست سمندری طوفان کے باعث صوبے کے مغربی اضلاع میں زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ تقریباً ۲۰۰ ۳ مربع میل کا علاقہ اس طوفان سے متاثر ہوا۔ کھڑی فصلیں بالکل تباہ ہوگئیں اور ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ صرف مدنا پور اور ۲۴ پرگنہ کے علاقوں میں ۱۱ ہزار افراد لقمۂ اجل بنے۔

یوپی، بہار اور بنگال میں پُرتشدد ہنگامے، گولیوں اور لاٹھیوں کا استعمال بھی جاری رہا۔ ۲۵/۱ کتوبر کو جاپان کے ہوائی جہازوں کی چٹاگانگ اور صوبہ آسام کے ہوائی اڈّوں پر بم باری اور پھر اگلے آٹھ دس روز تک حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس سے بنگال پر جاپانیوں کے زیرِ تسلط جانے کے تاثر کو مزید تقویت ملی۔ صوبائی گورنر سر جان ہربرٹ نے اپنی تقریروں میں بنگال کے جاپانیوں کے زیرِ تسلط جانے کو بعید از امکان قرار نہیں دیا۔ بنگال کے فوجی حکام آسام اور بنگال میں ایسی تنصیبات کو از خود تباہ کروانے لگے جو جاپانیوں کے حملے کے بعد مدد و معاون ہوسکتی تھیں۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کے اوائل میں یورپ، افریقا اور ایشیا کے تمام محاذوں پر جرمنی، اٹلی اور جاپان کے نئے حملوں کا زور کم ہوگیا تو برطانوی فوج نے ۱۹/دسمبر کو برما پر جوابی حملہ کیا۔ اس حملے سے بنگال کے عوام کے مصائب میں کمی آنے کے بہ جائے مزید اضافہ ہوا۔ چاول کے بھاؤ ساڑھے سات روپے فی من سے بڑھ کر سولہ روپے فی من تک پہنچ گئے۔ مشرقی بنگال کی بہت سی جھونپڑیوں میں قحط کا بھوت ناچنے لگا۔ اچھی فصل ہونے کے باوجود ''انکار کی پالیسی'' کے تحت فالتو چاول جبراً وصول کرنے اور ایک لاکھ پچاس ہزار ٹن چاول کی درآمد برما سے بند ہوجانے کے باوجود حکومت نے اس قلت کو دور کرنے کا کوئی متبادل انتظام نہیں کیا۔ جاپانیوں نے برما میں برطانیہ کے جوابی حملے ناکام کرنے کے لیے چٹاگانگ، فینی، آسام اور دیگر علاقوں پر روزانہ ایسے ہوائی حملے شروع کیے جن سے ان علاقوں کے کسانوں کی معمول کی زندگی درہم برہم ہوکر رہ گئی۔ اناج کے ساتھ ساتھ اِن علاقوں میں نمک کی بھی کمی واقع ہوئی۔ ۲۸ دسمبر کو کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اہتمام پریزیڈنسی ڈویژن میں بھوکوں کا جلوس نکالا گیا۔

قحط کی وجہ سے روزانہ سیکڑوں اموات واقع ہورہی تھیں۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں بنگال اسمبلی اور کونسل کے بجٹ سیشن میں ابتداً کئی روز تک ایوان کے ارکان نے صوبے کی غذائی صورتِ حال پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ ایک طرف غریب کسانوں میں قوتِ خرید نہ ہونے کے برابر تھی تو دوسری طرف افراطِ زر کی شرح ۲۲۵ فی صد تک پہنچ چکی تھی۔ کسانوں کی بڑی آمدنی پٹ سن سے ہوتی تھی۔ جیوٹ ایسوسی ایشن نے اس سنہری ریشے کی قیمت ۱۴ سے لے کر ۱۹ روپے فی من تک مقرر کی تھی۔ اس بھاؤ میں پٹ سن بیچ کر ۲۲ سے ۲۵ روپے فی من چاول خریدنا کسانوں کے بس میں نہیں تھا۔ کئی ارکانِ اسمبلی

نے کسانوں کی بدحالی کے بارے میں حکومت کی غفلت پر نکتہ چینی کی، تو ۶ مارچ کو وزیرِ زراعت خان بہادر ہاشم علی خان کا جواب یہ تھا کہ چاول کے زیرِ کاشت رقبے میں اضافے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ۱۵، مارچ کو وزیرِ مال پی۔ این بینرجی کا بیان تھا کہ فلڈ کمیشن نے بندوبست دوامی اور لگان داری کے نظام کو ختم کرنے کی سفارش کی ہے۔ بعد میں خواجہ ناظم الدین کی مخلوط حکومت نے قحط سے نبٹنے کے لیے اقدامات شروع کیے اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف مہم شروع کی ۲۸۔

۳ر مئی ۱۹۴۳ء کو بنگال اسمبلی کے اسپیکر سر عزیز الحق نے نلنی رنجن سرکار کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تجارتِ خوراک اور صنعت کے محکموں کا چارج سنبھالا تو ان کا خیال یہی تھا کہ بنگال میں چاول کی قلت اور مہنگائی مصنوعی ہے اور اس کے لیے وہ وطن دشمن عناصر ذمے دار ہیں جو ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرتے ہیں۔ چناں چہ اس نے ۱۵ مئی کو کرشن نگر میں استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ حکومتِ بنگال کے کروڑوں عوام کو فاقہ کشی سے بچانے کے لیے وطن دشمن عناصر کو سزا دینے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ایک ہفتے میں چاول کی قیمتوں میں خاصی کمی آ جائے گی ۲۹۔ مگر ایسا ہوا نہیں بلکہ بنگال میں چاول کی قلت اور مہنگائی میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ صورتِ حال جب قابو سے باہر ہوگئی تو وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین حکومتِ ہند سے استدعا کرنے دہلی پہنچے تا کہ چاول کی بین الصوبائی نقل و حمل پر عائد پابندی اٹھوائی جا سکے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ پابندی اٹھالی جائے تو صوبۂ آسام صوبۂ بہار کی چاول کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ ۲۷ر مئی کو دہلی میں ایک تقریر کے دوران انھوں نے انکشاف کیا کہ بنگال میں چاول کے نرخ ۳۰ سے ۴۰ روپے فی من تک پہنچ چکے ہیں۔ جن کی وجہ سے عوام شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ تین چار روز قیام کے بعد کلکتہ واپسی پر انھوں نے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکنِ خوراک میجر جنرل وڈ (Wood) کی جانب سے ہر ممکن امداد کے وعدے اور یقین دہانی سے عوام کا حوصلہ بڑھایا۔ ۳۰ر مئی کو خواجہ ناظم الدین اور ان کے وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے کلکتہ میں اڑیسہ کے وزیرِ اعلیٰ مہاراجا آف پارلا کی میدی (Maharaja of Parlakimedi) سے ملاقات کر کے اس امر کا جائزہ لیا کہ صوبۂ اڑیسا اس مسئلے پر بنگال کی کس طرح مدد کر سکتا ہے۔ ۳۱ر مئی ناظم الدین، شیلانگ گئے اور وہاں آسام کے وزیرِ اعلیٰ سے بھی بات چیت کی لیکن ان ساری کوششوں کا کوئی طور پر مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ بہار، آسام اور اڑیسا کی حکومت بنگال کے لیے چاول کی فراہمی میں مدد پر آمادہ نہیں تھی۔ ۷ر جون ۱۹۴۳ء کو ذخیرہ اندوزی کے خلاف سرکاری مہم کا آغاز ہوا۔ صوبے بھر میں ایک لاکھ خوراک کمیٹیاں بنائی گئیں مگر یہ مہم بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور جون کے آخری ہفتے میں ہر طرف سے قحط قحط کا شور بلند ہونے لگا۔ ۲۶ر جون ۱۹۴۳ء کو بنگال نیشنل چیمبر آف کامرس کے صدر اے۔ سی۔ سین نے اپنی تقریر میں کہا کہ بہت جلد پورا صوبہ قحط کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔ مولوی فضل الحق کا اسمبلی میں واویلا کوئی مثبت اثر نہ ڈال سکا۔ حالات روز بہ روز بدتر ہوتے چلے گئے۔ آفت زدہ لوگوں کے لیے امدادی رقم کے ۸۸ لاکھ بھی کوئی مدد نہ کر سکے کیوں کہ بہار نے بھی اناج کی برآمد کی اجازت نہیں دی۔ جون ۱۹۴۳ء میں اڑیسا کی حکومت پہلے ہی کھلی منڈی میں اناج کی

خریداری پر پابندی لگا چکی تھی۔ آسام کی حکومت نے بھی اسی قسم کے دلائل دے کر بھوکے بنگال کو اناج فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگی اخبارات نے الزام لگایا کہ تینوں ہم سائے صوبوں کی ہندو وزارتوں کی جانب سے بنگال کو اناج فراہم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح خواجہ ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت کو ناکام کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بنگال کے جن علاقوں کو قحط کا سامنا ہے وہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں یا اچھوتوں پر مشتمل تھی۔ تینوں صوبوں کے ہندو اربابِ اقتدار اور اناج کے ہندو بیوپاریوں کو اُن بدنصیبوں کے زندہ رہنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ گویا مشرقی پاکستان میں ہندو مسلم تضاد، وحشت بربریت اور سنگ دلی کی ساری حدود پار کر چکا تھا۔

تیسری غذائی کانفرنس میں حکومتِ بنگال سے اس امر کی وضاحت بھی طلب کی گئی کہ اُس نے اناج کے وسیع ذخائر کس طرح تقسیم کیے۔ نئی دہلی کے مذکورہ اقدام سے بنگال کے بھوکے عوام کے پیٹ میں کچھ بھی نہ پڑا۔ اگست ۱۹۴۳ء تک صوبے کے مختلف علاقوں میں قحط سے ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ آخر کار بنگال کو مجبوراً قحط کا اعلان کرنا پڑا۔ اِس اعلان کے بعد چٹاگانگ اور دوسرے علاقوں میں امدادی مراکز کھولے گئے۔ بھکاریوں کے لیے مفت دال بھات کا انتظام کیا۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۳ء کے بعد اخبارات میں ہر روز ہول ناک خبروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں کی سڑکوں پر سیکڑوں لاشیں اٹھائے جانے کی خبریں روز کا معمول بن گئیں ۳۰۔ ہلاکتوں کی تعداد کے بارے میں متضاد اطلاعات کی وجہ سے یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ کس قدر ہلاکتیں ہوئیں۔ البتہ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قحط میں ''لاکھوں عوام بن آئی موت مر گئے اور ملک کا یہ حصہ زندہ جہنم کا منظر پیش کرنے لگا''۳۱۔ معروف محقق اور ماہرِ سماجیات حمزہ علوی نے لکھا کہ اس قحط میں ''۳۵ لاکھ کے قریب وہ غریب کسان لقمۂ اجل بن گئے جن کے پاس قحط کے دوران گذر اوقات کے لیے کوئی رقم محفوظ نہیں تھی''۳۲۔ بدانتظامی اور مقامی حکام کی بدنیتی کی وجہ سے قحط کے ساتھ ساتھ وبائی امراض بھی پھوٹ پڑے جن سے ہلاکتوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا ۳۳۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ برعظیم کے اس زرخیز ترین صوبے کی پوری کی پوری آبادی تھوڑے عرصے میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ ستمبر کے وسط میں ہونے والے صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں حزبِ اختلاف کے اراکین نے صوبے میں قحط کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے بھی ہلاکت خیزی کے اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اراکین کے مطابق صوبے بھر میں کوئی گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں لوگوں کو دو وقت کھانا نصیب ہو۔ ایک اور رکن کا بیان تھا کہ ہر قصبے میں روزانہ اوسطاً ۲۵ ہزار افراد معدوم ہوتے جا رہے ہیں، جو صورتِ حال اس وقت صوبۂ بنگال کی تھی، ایسی معاشی بدحالی کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ۳۴۔

۱۹۴۳ء کے قحط کی تصاویر دیکھ کر بھی اس زمانے کے بنگال کی شکستہ حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِس موضوع پر دنیا کی مختلف جامعات میں سماجی ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں، اس کے اعداد و شمار اور نتائج بھی بڑے ہول ناک بیان کیے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں الزام تراشی کر کے ملبہ ایک دوسرے کے سر ڈالنے کی کوششوں میں مصروف رہیں اور

پورے بنگال میں انسانیت بلکتی اور سسکتی رہی۔کلکتہ یونی ورسٹی شعبہ بشریات (Anthropology) کے اساتذہ اور طلبا نے جو سروے رپوٹ شائع کی، اِس کے مطابق بنگال کے ۴۴ء۴ فی صد خاندانوں کا معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی تعلقات کا شیرازہ بکھر گیا۔لوگ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو گئے۔شوہروں نے بیویوں کو، بیویوں نے بیمار شوہروں کو، بچوں نے بوڑھے اور اپاہج والدین کو گھروں سے نکال دیا۔ بھائیوں نے بھوکی بہنوں کی التجائیں سننے سے انکار کر دیا۔قحط کا شکار ہونے والے ۵۲ء۷ فیصد اچھوت اور ۳۰ء۹ فیصد مسلمان تھے۔ ۱۵ء۴ فی صد اونچی ذات کے ہندو اور ایک فی صد عیسائی بھی قحط کے متاثرین میں شامل تھی۔سب سے زیادہ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور قحط کا شکار ہوئے۔ان کا تناسب ۴۷ء۷ فی صد تھا۔اس کے بعد چھوٹے مالکانِ اراضی جن کا تناسب ۲۵ فی صد بنتا ہے۔ پرچون فروشوں کا تناسب ۷ فی صد اور بھکاریوں کا ۶ء۶ فی صد بنتا ہے۔کھیتوں کے مزدوروں کے اپنے اپنے علاقوں سے چلے جانے کی وجہ سے آئندہ فصل پر بھی اس کا برا اثر پڑا۔اس سروے رپورٹ سے بنگال اور دوسرے علاقوں کے تعلیم یافتہ درمیانے طبقے کی روح کانپ اُٹھی مگر مقامی منافع خوروں اور برطانوی سامراج کے ضمیر میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

نلنی رنجن سرکار نے اپنے بیان میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت پر یہ الزام بھی لگایا کہ مسلم لیگ کے خزانچی مرزا ابو الحسن اصفہانی کی فرم کو اناج کی خریداری کی ایجنسی دینے کی وجہ سے غذائی قلت کے مسئلے کو حل کرنے میں ناکامی ہوئی۔اگر اس کمپنی کے بہ جائے چند ہندو فرموں کو یہ کام سپرد کیا جاتا تو صورتِ حال اس قدر خراب نہ ہوئی ہوتی۔جولائی ۱۹۴۳ء کے بعد تقریباً سارے ہی ہندو لیڈر اور اخبارات یہ الزام عائد کرتے رہے۔مولوی فضل الحق بھی ان کے ہم نوا تھے۔مگر مسلم رائے عامہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے خلاف اس عرصے میں کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔اس کے برعکس بنگالی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ گروہ یہ باور کراتا رہا کہ قحط کی بڑی وجہ بہار اور اڑیسہ کی ہندو حکومتوں کا بروقت اناج مہیا کرنے سے انکار تھا[۳۵]۔فرقہ ورانہ تضاد کی اس نوعیت کی آئینہ داری ۱۱۴ اکتوبر کو کلکتہ کے ایک بنگالی اخبار باسومتی میں بھی ہوئی۔

اس نے اپنے اداریے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ''اگر اب بنگال میں دو کروڑ ہندو اور دو کروڑ مسلمان مر جائیں تو آبادی کا یہ خلا سنتھال، اوراؤں، خاصی اور جینتیا کی پہاڑیوں کے اِن قبائل سے پُر ہو جائے گا جو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔اس طرح دو سال سے بھی کم عرصے میں بنگال کی مسلم اکثریت پانچ اور ایک کی نسبت سے اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی[۳۶]۔ہری داس موزامدار نے اس روزنامے ''باسومتی'' کا یہ اقتباس نقل کرتے ہوئے یہ تعبیر پیش کی کہ اس قدر شدید قحط کے زمانے میں بھی اس ہندو اخبار کے نزدیک یہ بات زیادہ ضروری تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت کو کیسے اقلیت میں تبدیل کیا جائے۔اخبار کے مطابق قحط میں اگر چار کروڑ مسلمان اچھوت مر جائیں یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو جائے گا۔۹/اکتوبر ۱۹۴۳ء کو گورنر سر تھامس رد رفورڈ کی نشری تقریر سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ آئندہ برطانوی حکو

مت بنگال کے قحط کے مسئلے پر قابو پانے کی جانب سنجیدگی سے توجہ دے گی۔ پالیسی میں تبدیلی کی ایک بڑی وجہ عالمی سطح پر برطانوی سامراج کی شقاوتِ قلبی کو موضوعِ گفتگو بنانا تھا۔

گذشتہ دو ماہ میں عالمی جنگ کا پانسا بھی پلٹ گیا تھا۔ جاپان اور جرمنی کی پسپائی، اٹلی کی نئی حکومت کا ہتھیار ڈالنا وغیرہ جیسے واقعات نے حکومتِ ہند کے لیے موافق حالات پیدا کر دیے تھے۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۴۳ء کو لندن میں حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کی غذائی صورتِ حال کے بارے میں قرطاس ابیض شائع کی جس میں بنگال کے قحط کی ذمہ داری برما کے سقوط، اکتوبر ۱۹۴۲ء کے سمندری طوفان، کلکتہ پر جاپانیوں کی بم باری، بیوپاریوں کی ذخیرہ اندوزی اور ۱۹۴۳ء کے سیلاب کے باعث ریلوے کا نظام درہم برہم ہونے پر عائد کی ہے۔ مسلم لیگ نے اس بدترین قحط کے ذمے داروں کا تعین کے لیے رائل کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جسے مسترد کر دیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریک پر اپنی تقریر کے دوران قحط کی ذمے داری حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ ہند پر عائد کی۔ ان کے خیال میں صوبائی حکومت کو اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔[۳۷]

قحط بنگال کے متاثرین کو نہ کسی بحث و مباحثے سے فائدہ تھا اور نہ ہی انھیں کسی قسم کی تحقیقات فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ انھیں تو پیٹ بھرنے کے لیے اناج کی ضرورت تھی اور وہ انھیں کسی صورت دستیاب نہ تھا چناں چہ اس دوران نہ صرف بھوک اور ہلاکت خیزی تیزی سے جاری رہی بلکہ ملیریا، ہیضہ، چیچک جیسے وبائی امراض نے مزید قیامت ڈھا دی۔ ۱۰/دسمبر کو کلکتہ کے میئر سید بدرالدجی کے مطابق ضلع مرشد آباد کی کنڈی سب ڈویژن کی چار لاکھ آبادی میں ۵۰ ہزار افراد ملیریا، ہیضہ اور دوسری بیماریوں سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ چٹاگانگ میں واقع کشتیا کی ۴۰ ہزار آبادی میں سے ۱۰ ہزار جاں بحق ہوئے۔ ۱۷/دسمبر کو وزیرِ ہند ایمری کا بیان ہے کہ ۲۷/جون سے ۱۳ نومبر تک بنگال پر یذیڈینسی میں ۸۹، ۳، ۷۷ افراد ہیضے سے ہلاک ہو گئے۔ مسلم لیگ ریلیف کمیٹی کے سیکریٹری چودھری معظم حسین کے ایک اخباری بیان میں بتایا کہ فروری مارچ ۱۹۴۳ء کے دوران بنگال کی چھ کروڑ عوام میں سے ساڑھے پانچ کروڑ قحط سے متاثر ہوئے۔ لوگ خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ اس قحط نے بنگال کا اخلاقی ڈھانچا بھی تباہ کر کے رکھ دیا۔ اعداد و شمار کی قیاس آرائیوں سے قطعِ نظر بنگال پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا قیاس تھا کہ قحط سے ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد ۶،۸۸،۸،۴۶ تھی۔ سرکاری اعداد و شمار دس سے بیس لاکھ تک بتاتے ہیں[۳۸]۔ لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق جیسا کہ حمزہ علوی نے بیان کیا کہ کم از کم تیس لاکھ افراد اس قحط کے نتیجے میں لقمۂ اجل بنے۔ ان ہلاکتوں پر برطانوی بے حسی کا انداز، ونسٹن چرچل کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس نے بنگال کے قحط کے بارے میں بات کرتے ہوئے دیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ:

> I hate Indians. They are a beastly people with a beastly religion. The famine was their own fault for breeding like rabbits[۳۹].

اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۳ء کا قحط درحقیقت ہندوستانیوں کے قتلِ عام کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ محض اقتدار اور منافع کی خاطر برطانیہ نے تاریخ کا سب سے بڑا قتلِ عام کیا چرچل نے ہنگامی سطح پر اناج کے جہاز بھیجنے کی

اپیلوں کو بار بار مسترد کیا۔ اِس مصنوعی طور پر پیدا کردہ قحط کو برطانوی راج کے تاریک ترین ابواب میں شمار کیا جائے گا۔ مدھوسری مکر جی نے *Churchill's secret War* میں کچھ ایسی دستاویزات کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چرچل براہِ راست بنگال کے اس شدید قحط کے ذمے دار تھے۔ کتاب میں چرچل کی پیش کردہ ہر دلیل کو غلط ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری عالمی جنگ کے دوران کابینہ اجلاس کے تجزیوں، وزارتی ریکارڈ اور ذاتی ریکارڈ کے تجزیے کے دوران اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ جن دنوں بنگال میں شدید قحط سے لاکھوں لوگ ہلاک ہو رہے تھے اِن ہی دنوں آسٹریلیا سے روانہ ہونے والا اناج سے لدا جہاز ہندوستان کے قریب سے گذر رہا تھا۔ بحیرۂ روم کے گودام بھی اناج سے بھرے ہوئے تھے۔ مکر جی کا کہنا ہے کہ آسٹریلیا نے قحط کے دوران مدد بھیجنے کی بار بار پیش کش کی لیکن جنگی کابینہ نے جہاز مہیا کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکا نے اپنے بحری جہازوں سے اناج بھیجنے کی پیش کش کی لیکن برطانیہ کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا[۴]۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے پیچھے چرچل کا شیطانی دماغ ضرور کام کر رہا ہوگا جو ہندوستانیوں سے اپنی نفرت کا اظہار پہلے ہی کھل کر کر چکا تھا۔

(۲)

قحطِ بنگال کے تناظر میں ادب کے مطالعے سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس ہولناک سانحے نے اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کو بے حد متاثر کیا۔ اردو میں اس سانحے کے حوالے سے جہاں اَن داتا از کرشن چندر وغیرہ جیسے افسانوں نے خوب شہرت حاصل کی وہیں ایسی بہت سی نظمیں بھی زبانِ زدِ عام ہوئیں جو قحطِ بنگال سے متعلق تخلیق کی گئیں۔ اس زمانے میں مختلف قومی تحریکوں نے سیاسی اور سماجی سطح پر ہل چل پیدا کی ہوئی تھی۔ قحط سے ہونے والی ہلاکتوں کی ذمے داری چوں کہ برطانوی استعمار کے سر تھی۔ لہٰذا اس سانحے سے متعلق لکھی گئی نظموں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور ان کے اقتدار کے خاتمے کی تدابیر کا راگ ضرور الاپا جاتا۔ جوشؔ نے قحط کی ہولناک تباہی سے قبل ہی ہندوستان میں مزدوروں، کسانوں اور عام لوگوں کی زندگی کی کس مپرسی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ نوآبادیاتی دور میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف شدید مزاحمتی رویہ بھی اپنایا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ہی ۱۹۲۹ء میں نظم ''کسان'' میں کسان اور ہل کا قصیدہ لکھتے ہوئے کسانوں کا مرثیہ بھی لکھ ڈالا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ترقی پسند نظریے سے قبل ہی وہ کسانوں کی بدحالی پر کئی نظمیں لکھ چکے تھے۔ وہ کسانوں کی بدحالی کا ذمہ دار جاگیرداری کے بہ جائے سرمایہ داری کو قرار دیتے ہیں۔ کسانوں کی بابت اِن کا کہنا تھا کہ:

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزو وقار　　کرتی ہے دریوزۂ تابشِ کلاہِ تاجدار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پہ مشقت کے نشاں　　کھیت سے پھیرے ہوئے منہ، گھر کی جانب ہے رواں
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے　　دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تار یکیٔ حرماں سے راہ فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منھ اُترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا، کچھ بھی نہیں گھر میں اِک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے! یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے!
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وشقاوت کے شرار جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ کیا چبا ڈالے گی او کم بخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی[۴۱]

جوشؔ نے اپنی شاعری میں مسلسل ایسے تصورات پیش کیے جو سرمایہ داری کے خلاف تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں انھیں ''پٹاری کا سڑا انگور'' اور ''پشتِ مخلوقات پر سرطان کا پھوڑا'' کہہ کر ہدفِ تنقید بنایا۔ مہاجن، ساہوکار، زردار، جاگیردار اور حاکم کی علامتیں دراصل استیصال کی علامتیں ہیں۔ نظم مستقبل میں ایک منضبط تصور پیش کرتے ہوئے معاشی اور اقتصادی نظام کے خطوط پہلی بار جوشؔ نے ہی پیش کیے:

پک رہا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج کل اِسی سر کے لیے تاجِ گل افشاں ہوگا
آج جس رعب سے ہے روئے عمارت پہ شکوہ کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا[۴۲]

لیکن انھیں اس بات کا بھی خوب احساس تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تبدیلی کا جو خواب وہ دیکھ رہے ہیں اس کی تعبیر ابھی دور ہے۔ ہندوستانیوں میں ابھی وہ حرارت پیدا نہیں ہوئی۔ اپنی نظم پست قوم میں وہ اپنی اسی کیفیت کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ابنائے ملک میں وہ بصیرت کہاں ہے جوش گردوں کی طوق پاؤں کی زنجیر کاٹ دے
اتنی غلام قوم، وہ ہمت کہاں ہے جوش اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کرسکے
اتنی ذلیل ملک کو فرصت کہاں ہے جوشؔ اِک حرفِ گرم سنتے ہی کو دے اُٹھیں دماغ

ہندوستان میں وہ حرارت کہاں ہے جوشؔ[۴۳]

جوشؔ اچھی طرح جانتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے ملک کا مزدور اور کسان بدحال ہے۔ سخت محنت اور مشقت کے باوجود اس کی زندگی میں سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ اکثر خوراک اُگانے والا کسان ہی غذائی قلت کا شکار رہتا ہے اور سرمایہ داروں کے زر میں روز بہ روز اضافے کا سبب بننے والا مزدور دو وقت کی روٹی کو محتاج رہتا ہے۔ اِس صورتِ حال پر اُن کی نظم مہاجن اور مفلس بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ابتدا میں ''مہاجن'' کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

دانت میلے، پنڈلیاں پے چیدہ، دھوتی داغ دار
ناک میں مونچھوں کے گونجے، پیٹ میں توندی کا غار

سامنے غلّے کے بورے پشت پہ الماریاں
بَغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زر داریاں

کہنیاں تکیے کے اندر، وزن سے دھنستی ہوئی
چُست صدری، دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی

خوب لے لے کر ڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پُھلائے، توند سہلاتا ہوا [۴۴]

اس کے بعد وہ ''مفلس'' کی حالت بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں موجود ان کروڑوں لوگوں کی زندگی کا منظر نامہ بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کی زندگی برطانوی استعمار کے ظلم و جبر کی وجہ سے بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ مفلسی کی بابت ان کا کہنا تھا کہ:

ضعف سے آنکھوں کے نیچے پتلیاں پھرتی ہوئیں
اوجِ خودداری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئیں

لاش کندھے پر خود اپنے جذبۂ تکریم کی
ملتجی چہرے پہ لہریں سی امید و بیم کی

قرض کی درخواست کی اُلجھی ہوئی تقریر میں
کپکپی اعصاب کی بے چین دل کی لرزشیں [۴۵]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب میں وہ پہلے ہی دست کاروں، خصوصاً ململ کے کاری گروں کے انگوٹھے کاٹے جانے کی جانب اشارہ کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عزائم اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم کو ہمارے سامنے پیش کر چکے تھے۔ اُن مظالم نے ہندوستانی معیشت کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کی عظیم مملکت جس کی بابت خود مغربی مورخین نے لکھا تھا کہ میلوں چلنے کے باوجود کوئی بھیک مانگتا دکھائی نہیں دیتا ہے، وہاں اب مفلس اور نادار لوگوں کی بہتات ہے۔ خصوصاً بنگال میں تو آئے دن کے قحط نے لوگوں کی کمر توڑ دی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی نظم بھیک کی آواز میں برطانوی راج کے ہندوستان خصوصاً معاشی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تصور کیجیے اُس ملک کی بے دست پائی کا
جہاں بنتا ہے شامِ بے نوائی نورکا تڑکا

جہاں بے داد ہوتے ہی فغاں ملتی ہے نالوں میں
گداؤں کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں کانوں میں [۴۶]

جوشؔ کے بعد ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا نے اردو شاعری کے اُن تمام مدھم نقطوں کو متعین شکل عطا کی اور پہلی بار ملک کے سامنے ایک واضح نقطۂ نظر پیش کیا یعنی ایک ایسی بنیاد جو طبقاتی شعور کی روشنی میں تیار کی گئی تھی۔ ایسی بنیاد جس کی تہہ میں پورے ملک کے عوام کے مفادات شامل تھے۔ آزادی کا وہ تصور جو حب الوطنی کے جذبات کے طلسم میں اب تک اسیر تھا، اُسے مفکرانہ انداز عطا کرنے کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر ہے۔ ایسا مفکرانہ انداز جو خالص معاشی بنیادوں پر ملک کے عوام میں یک جہتی کا شعور بے دار کر سکے۔ اس تحریک کے خدوخال ابھارنے میں ایک طرف تو بین الاقوامی فضا میں استعماریت کے سامراجیت اور فسطائیت سے چھٹکارا پانے کی وہ تمنا تھی جو اشتراکی نظام کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی اور معاشی لوٹ کھسوٹ اور استیصال کے خلاف اعلانِ بغاوت تھی تو دوسری طرف ہندوستان میں تیزی سے بدلتے سیاسی

حالات جو عوام کو احساس دلا رہے تھے کہ غلامی دراصل سیاسی محکومی ہی سے عبارت نہیں تھی بلکہ یہ ایک بہت بڑے نظام کا چھوٹا سا پرزہ ہے۔

ہندوستان کی قومی تحریکوں سے وابستہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ہندوستانی عوام انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے باوجود ہندوستانی سرمایہ داروں سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے[۴۷]۔ دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا۔ اگر چہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے جوڑا۔ ہندوستان کے نئے ادب میں بھی انھوں نے ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو موضوع بنایا[۴۸]۔ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل اس زمانے کے ادیبوں کے محبوب موضوعات بن گئے، ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی ہر تبدیلی ان کی تخلیقات کا موضوع بنیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ لاکھوں لوگوں کو نگل جانے والے بنگال کے قحط پر اس تحریک کے لوگ خاموش رہے ہوں۔ اس تحریک کے سرخیل علی سردار جعفری نے اپنی نظم بنگال میں قحط سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے ہر منظر کو قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ اندرونی اور بیرونی سیاست کے شکار بنگال پر اس وقت جو کیفیت تھی اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

آج ہے بدلا ہوا رنگِ مزاجِ روزگار کرگسوں کی طرح منڈلاتی ہے روحِ انتشار
آہ! وہ بنگال وہ حسن و محبت کا دیار ہو گیا غیروں کی دیرینہ سیاست کا شکار
اس مصیبت میں اگر اپنے بھی بے گانے رہے فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے[۴۹]

قحط نے چھے کروڑ آبادی والے بنگال کا کوئی حصّہ نہیں چھوڑا۔ صوبے کے تمام حصّے اس سے متاثر ہوئے۔ شہر ہو یا گاؤں ہر جگہ موت ہی موت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کرب ناک منظر کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

بستیوں میں گاؤں میں شہروں میں لہراتی ہے موت جس طرف دیکھو اسی جانب نظر آتی ہے موت
چھین کر ماؤں سے بچوں کے لیے جاتی ہے موت زندگی ہے سرنگوں اور ناز فرماتی ہے موت
گاؤں ویراں ہو گئے، ہر جھونپڑا سنسان ہے خطۂ بنگال ہے یا ایک قبرستان ہے[۵۰]

شاعر یہاں بنگال کو ایک قبرستان سے تشبیہ دینے کے ساتھ ساتھ جو لوگ ابھی زندہ تھے، انھیں زندہ لاشوں سے تعبیر کر رہے تھے۔ غذائی قلت نے ان کا جو حال کر رکھا ہے اس کی تصویر پیش کرتے ہوئے نقاہت، کمزوری اور جسمانی طور پر لاغری نے انھیں کن کن مصائب کا شکار بنا رکھا تھا اس کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی زندگی کو جانور کی زندگی سے بھی بدتر قرار دیتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اُٹھتا ہے بخار میتیں ہیں بے کفن چادر اُڑھاتا ہے غبار
چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار بے بسی سے آج ان کو چوستے ہیں شیرخوار

رینگ کر لاشوں سے ہٹ جائیں یہ طاقت بھی نہیں　　ان میں انسانوں کی ہلکی سی شباہت بھی نہیں
دھنس گئیں ہیں بھوک سے آنکھیں لٹک آئے ہیں گال　　ہڈیوں پر خشک چمڑے کی طرح لپٹی ہے کھال
ماؤں کے دکھتے ہوئے شانوں پہ بچے ہیں نڈھال　　آج وہ دم توڑتے ہیں رہ گزاروں کے قریب[۵۱]

عالمی جنگ کے پس منظر میں جاپان کی برما کی طرف چڑھائی اور برطانوی استعمار کے رویے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ ملک کے سیاست دانوں کو ہوشیاری اور سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

اِک طرف دیو حکومت گردنوں پر ہے سوار　　اِک طرف جاپان کا لشکر قطار اندر قطار
اور اِس حالت میں ہندوستان فاقوں کا شکار　　ہوشیار اے مرد، میدانِ سیاست ہوشیار
ایک ہو جاؤ کہ دم سینے میں گھٹ جانے کو ہے　　قوم کا سرمایۂ اخلاق لٹ جانے کو ہے[۵۲]

ہندوستان کا وہ حصّہ جہاں انقلاب کی حرارت بھی تھی اور سرسبز و شادابی بھی تھی، آج ان کو قحط کی صورت میں مصائب و آلام کا شکار بنا دیا گیا۔ صوبے کی موجودہ حالت کی بابت ان کا کہنا درست تھا کہ:

آج اِس میں قحط ہے، آلام ہے، ادبار ہے　　زندگی ہے آج اس کا ہر نَفَس بے زار ہے[۵۳]

انسانیت کی سسکتی اور بلکتی تصویر ان کی ایک اور نظم بھوکی ماں بھوکا بچہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک بچے کی کس مپرسی اور لاچاری کے بیان میں دراصل بنگال کے ہر ماں اور بچے کی فریاد اس نظم میں سنائی دیتی ہے جسے سننے والا کوئی نہیں۔ ماں کے پاس محض بہلاوے کے سوا کچھ نہیں اور اسی بہلاوے میں دونوں ماں اور بچہ کس طرح موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ یہ منظر بہت دردناک ہے۔ شاعر کے حساس دل نے اس منظر کو کس جبر کے ساتھ بیان کیا ہوگا، نظم کے مطالعے سے اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میرے مُنے میرے معصوم مرے نورِ نظر
آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو
اپنی آغوشِ محبت میں سلا لے تجھ کو
میرے افلاس کے ہیرے سو جا
نیند میں آئیں گی ہنستی ہوئی پریاں ترے پاس
بوتلیں دودھ کی، شربت کے کٹورے لے کر
جانے آواز کی لوری تھی کہ پریوں کا طلسم
نیند سی آنے لگی بچے کو

کھنچ گئی نیلگوں ہونٹوں پہ خموشی کی لکیر
مٹھیاں کھول دیں اور موند لیں آنکھیں اپنی
یوں ڈھلکنے لگا منکا جیسے
شام کے غار میں سورج گر جائے
جھک گئی ماں کی جبیں بیٹے کی پیشانی پر
اب نہ آنسو تھے نہ سسکی تھی نہ لوری نہ کلام
ایک سناٹا تھا
ایک سناٹا تھا تاریک وطویل [۵۴]

اسی طرح ایشیا جاگ اٹھا میں بھی ہندوستان کے رستے ہوئے زخم اور آنسوؤں کو پیش کرنے کی عمدہ کوشش نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر پورے ایشیا کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے بھوک سے نڈھال لوگوں کا حال اس نظم میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

یہ ایشیا ہے، جوان شاداب اور دھنوان ایشیا ہے
کہ جس کے نردھن غریب بچوں کو بھوک کی ناگ ڈس رہے ہیں
وہ ہونٹ جو ماں کے دودھ کے بعد بھر واقف نہ ہوئے کبھی دودھ کے مزے سے
زبانیں ایسی جنھوں نے چکھا نہیں گیہوں کی روٹیوں کو
وہ پیٹ جو بھوک ہی کو بھوجن سمجھ رہے ہیں
یہ نادر روزگار انساں
یہ آنکھ کی پتلیاں، جو خون اور پیپ کی طرح بہہ رہی ہیں
یہ چہرے کھنڈروں کی طرح ٹوٹے
یہ بازو لکڑی کی طرح سوکھے
یہ پیٹ مٹکوں کی طرح پھولے
یہ مفلسی، یہ جہالت کی رات، بے چاند بے ستارے
یہ بھوک، یہ بے بسی، یہ نفرت، یہ ہنستے پھوڑے
لٹکتے گھینگے
دہکتے ناسور، چیختے زخم، رینگتے جسم جیسے کیڑے

تمھاری سرمایہ دار ''تہذیب'' کی کہانی سنا رہے ہیں[۵۵]

سیماب اکبر آبادی نے رومانی انقلاب سے متعلق متعدد نظمیں کہیں مگر جب ان کی نظر فاقہ زدہ لوگوں پر پڑی تو وہ بھی قحط سے متاثر انسانوں کو نظر انداز نہیں کر پائے۔ بنگال میں قحط سے متاثرہ بھوکے، مفلس اور نادار انسانوں کی جو تصویریں ملک اور بیرونِ ملک پہنچیں، اس نے سیماب سے ''بھوکا ہندوستان'' جیسی نظم لکھوائی۔ بنگال کے لوگوں کی حالت دیکھ کر، اس نظم میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

آج زباں پر ہے دنیا کی بھوکا ہندوستان　　بھوک کے قصّے، سنتے سنتے کانپ گیا ایمان[۵۶]

ایک اور نظم کلکتہ میں بھی وہ ہندوستان کے اس خطے میں آنے والے قحط سے پیدا ہونے والی صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں پائی جانے والی عمومی پریشانی کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک مدت سے پریشاں دیکھتا ہوں میں تجھے　　شعلہ و شبنم بداماں دیکھتا ہوں میں تجھے
بھوک اور فاقوں سے پاتا ہوں تجھے اکثر نڈھال　　کثرتِ امراض سے بگڑا ہوا ہے تیرا حال[۵۷]

طویل نظم عالمِ آشوب میں بھی انھوں نے بنگال کی سیاسی فضا کو عالمی تناظر میں دیکھتے ہوئے وہاں پر ہونے والی تبدیلی کے مثبت، منفی پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ جاپان کی جانب سے برما اور پھر متوقع بنگال پر چڑھائی کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ان کا کہنا تھا کہ:

جاپان کرے فضا کو برہم نہ کہیں　　پھینکے اور کچھ بڑھ کے یہ بم نہ کہیں
کلکتہ سے ہے گیا فقط تھوڑی دور　　بربادِ ہو خواب گاہِ گوتم نہ کہیں[۵۸]

اس طرح جاپان اور جرمن کے گٹھ جوڑ جس کا تفصیلی ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے، کی بابت وہ کہتے ہیں کہ:

جس قوم پہ وقتِ ابتلا آتا ہے　　اُس قوم پہ ادبار ہی منڈلاتا ہے
ہے لومڑی شہر کی اُلش پر نازاں　　جاپان بھی جرمن سے ملا جاتا ہے[۵۹]

اس قحط کے بعد ہندو اور مسلم قیادت جس طرح سے مذہبی منافرت کا مظاہرہ کر رہے تھے اُس کو سامنے رکھتے ہوئے سردار جعفری کا کہنا تھا کہ:

غارت کیے تسکین کے پہلو جس نے؟　　ہر چیز پہ کر لیا ہے قابو جس نے
کایا پلٹتی ہوئی نظر آتی ہے　　یہ کر دیا بنگال پہ جادو کس نے
یہ وقت ہے آزمائش ہمت کا　　موقع ہے یہی مروت و شفقت کا
اے خود غرضو! بھوک کی پیشانی پر　　لیبل نہ لگاؤ مذہب و ملت کا[۶۰]

بنگال کے اس سانحے کے پس منظر میں جگر مرادآبادی کی نظم قحطِ بنگال کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ جگر بنیادی

طور پر تغزل کے شاعر ہیں۔ اشعار میں غنائیت اور ترنم کی وجہ سے ہمیشہ، انھیں عوامی پذیرائی حاصل رہی۔ وہ خالص عشقیہ شاعر تھے لیکن قومی تحریک سے بھی وہ اس قدر متاثر تھے کہ ان کی شاعری کو ملکی سطح پر اس تناظر میں بھی خوب سراہا گیا اور وہ ایک قومی شاعر کے طور پر بھی اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ کہیں کہیں اُن کی غزلیں نظم کا انداز اختیار کر جاتی ہیں اور اِسے نظم کے تناظر میں ہی دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے غزل کی ہیئت میں نظم کا جو انداز اختیار کیا، اُسے خوب اچھی طرح نبھا یا بھی۔ قحطِ بنگال پر ان کی غزل نما نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افلاس زدہ روتے بلکتے لوگ، بے گور و کفن لاشیں، بچوں کی تڑپ اور اس قحط سے وابستہ اور بہت سے مناظر اس نظم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں — ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ — بے گور و کفن خاک پہ سر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا، وہ سسکنا — ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں[۶۱]

جگر کی یہ نظم اپنی تاثیر کے لحاظ سے ایک عمدہ نظم ہے۔ اس مختصر نظم میں شاعر نے قحط سے متعلق اہم امور کی خوب نشان دہی کی ہے۔ مثلاً بہار، اڑیسہ اور آسام کی جانب سے چاول کی فراہمی کے حوالے سے منفی رویہ ہو یا اس کے نتیجے میں ہونے والی انسانیت کی تذلیل جگر کی نظر ہر اُس پہلو تک گئی اور اس کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھالا۔ جیسے:

بے مہری و بے داری و افلاس و غلامی — ہے شامتِ اعمال مگر دیکھ رہا ہوں
انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر — دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
اِک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھ کو — اِک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں[۶۲]

جگر کو اس بات کا یقین تھا کہ اس اذیت ناک سانحے کے بعد سامراج کی ظالمانہ پالیسی کے خلاف لوگ ضرور اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ وہ اس تخریب میں بھی تعمیر کی صورت تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بابت وہ کہتے ہیں کہ:

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیرِ تاباں — ہونے کو ہے اُس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت — تخریب بہ عنوانِ دِگر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کے آثار تو کچھ اور ہیں لیکن — اِک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں
بے داریِ احساس ہے ہر سمت نمایاں — بے تاجیِ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے — میں صاف اِن آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا ہے عنادل کا نشیمن — صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
خاموش نگاہوں میں ابھرتے ہوئے جذبات — جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں[۶۳]

شاعر ہو یا عام انسان، اس کی زندگی اور موت، امن و جنگ، آسودگی اور بھوک، انصاف اور ظلم، مساوات اور طبقاتی،

ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اِس بحرانی دور میں جب کہ عالمی سطح پر استعمار کے خلاف شدید ردِعمل دیکھنے میں آتا ہے، اردو شعرا کی بڑی جماعت نے بھی اپنا فریضہ خوب نبھایا۔ وامق جون پوری بھی شاعری کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی شاعری کے ذریعے جدوجہد کر کے سرمایہ دارانہ نظام کے مکروہ چہرے ہمارے سامنے لانا چاہتے تھے۔ وامق نے اپنی مشہور نظم بھوکا بنگال لکھ کر مقبول شعرا کی صف میں اپنی جگہ بنالی۔ اس نظم کا آہنگ، اس کا اثر، اس کی سادگی اور اس کا اجتماعی جوش سب غور سے دیکھے جانے کی چیزیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند اپنے ذہن کی پوری طاقت سے زندگی اور شاعری کے رشتے کو سمجھنے میں لگے ہوئے تھے، اسی لیے ان کی اس نظم میں مستقبل کی عوامی شاعری کی جھلک بھی نظر آتی ہے [۶۴]۔ وامق اس مشکل گھڑی کو ہندوستان کی سرزمین کے لیے ایک کڑا امتحان قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال
دھرتی ماتا کی چھاتی پہ چوٹ لگی ہے کاری
مایا کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری
اب سے اُٹھ جانیند کے ماتے دیکھ تو جگ کا حال
رے ساتھی دیکھ تو جگ کا حال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال [۶۵]

قحط سے ہونے والی ہلاکتوں اور ندی نالوں میں بے گور و کفن لاشوں کے وحشت ناک منظر کا بیان ہو یا مہنگائی کی چکی میں پسے معصوم لوگ، ہر پہلو کو نظم میں بیان کرنے کی کچھ اس طرح کوشش کی گئی ہے کہ اس سانحے کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال
پیٹھ سے اپنے پیٹ لگائے لاکھوں الٹے کھاٹ
بھیک منگائی سے تھک تھک کر اترے موت کی گھاٹ
جین مرن کے ڈانڈے ملائے بیٹھے ہیں چنڈال رے ساتھی بیٹھے ہیں چنڈال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال
ندی نالے گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے کا الٹ گیا بیوپار
مٹھی بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال

سستا ہے یہ مال رے ساتھی سستا ہے یہ مال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال[۶۶]

حکومت کی بدنظمی، ذخیرہ اندازوں، ساہوکاروں اور بنیوں کے گٹھ جوڑ نے سماجی اور اخلاقی سطح پر خاندان کے شیرازے کو جس طرح بکھیر کر رکھ دیا، اس کا حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر اس تلخ حقیقت کی بھی نشان دہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قحط نے جوان لڑکیوں سے محض مٹھی بھر چاول کے بدلے جسم فروشی جیسا مکروہ فعل کروایا۔ شاعر کا کہنا ہے کہ:

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال
کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے بنیے سارا اناج
سندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے چار طرف بھونچال
چار طرف بھونچال رے ساتھی چار طرف بھونچال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال[۶۷]

قدرت اللہ شہاب نے بھی عورتوں کی بے حرمتی کی بابت لکھا یعنی کہ عورتیں جو برسرِ عام بیچی جاتی تھیں۔ ساہوکاروں اور ذخیرہ اندوزوں کے تو کیا ہی کہنے، ریلیف کے لیے آئے حکومتی نمائندے اور قحط سے متاثرین کے لیے کھولے گئے غریب خانوں سے خوراک کی جو تقسیم ہوتی اس عمل کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

> غریب خانے میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے بھوک اور افلاس کافی شرط نہ تھے۔ سب سے پہلے گاؤں یا علاقے کا مکھیا، زمین دار یا معزز شہری ایک پرچی جاری کرتا۔۔۔ اس کے بعد سرکل افسر اس پرچی کی تصدیق کرتا تھا۔ ان دونوں مرحلوں میں تاخیر کے بڑے امکان تھے لیکن اگر خوش قسمتی سے کسی خاندان میں کوئی جوان اور قبول صورت لڑکی بھی شامل ہے، تو ہر مرحلے پر وہ بڑے موثر پروانۂ راہ داری کا کام دے سکتی ہے۔۔۔ بچوں اور بوڑھوں کو تو ان کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا لیکن سپروائزر سے لے کر اسٹور کلرک، ریکارڈ کلرک، باورچی، سقہ، مہتر سب اپنی اپنی توفیق کے مطابق جوان عورتوں کی پزیرائی میں منہمک ہو جاتے تھے۔ کوئی انھیں چوری چوری خوش بو دار صابن کی ٹکیاں دیتا تھا، کوئی دودھ کا ڈبا، کوئی بسکٹ، کوئی سگریٹ، کوئی وٹامن کی گولیاں۔ غریب خانہ ہو یا راحیل خونڈ کر کی جھونپڑی، بھوک کی منڈی میں جسم، جاں اور جنس کا ایک ہی ریٹ تھا"[۶۸]۔

اس طویل اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قہرِ الٰہی کے اس دور میں بھی اخلاقی طور پر سماج کی حالت کیا تھی۔ اردو شعرا نے بھی اصورتِ حال کو موضوع بنایا۔ قتیلؔ شفائی نے اپنی آپ بیتی میں ایک گیت کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھا کہ قحط

کے زمانے میں عورتوں کی عزت کے ساتھ جو کھلواڑ کیا جا رہا تھا، یہ گیت اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ گیت کے چند بول ملاحظہ کیجیے:

ماتا دیکھ اپنی سنسار
تیری بیٹی لاج لٹائے تجھ کو لاج نہ آئے
ان جل دے کر جیون چھینے
دھن والوں کی رات
ماتا دیکھ اپنی سنسار [۶۹]

قومی شعور کا جو تانا بانا اس دور میں بُنا گیا اور جس شد و مد کے ساتھ ادب کو سماجی مسائل سے ہم آہنگ کیا گیا، وہ اب ادبی تاریخ کا حصّہ ہے۔ قحطِ بنگال کے موضوع پر لاتعداد نظموں اور غزلوں کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے شاعر اور ادیب ملکی مسائل سے لاتعلق نہیں تھے۔ قحط کے تناظر میں تخلیق کی گئی شاعری کے مطالعے سے ایک بات تو پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری کے ہر دور میں قومی یک جہتی کے عناصر پوری طرح موجود رہے ہیں۔ اردو شاعری کے دل میں پورے ہندوستان کا درد تھا، اس علاقے کا درد بھی جہاں یہ زبان نسبتاً کم بولی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں اس زبان کے ساتھ ہر دور میں نفرت کا رویہ اختیار کیا گیا۔ اردو زبان کی شاعری نے ہندوستان کے کسی گوشے میں ہلکے سے کانٹے کی چبھن کو پورے ہندوستان کی تکلیف اور درد سمجھا اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ممکن ہوا کہ اردو شاعری کو قومی یک جہتی کا سچا شعور حاصل تھا۔ اردو شاعری دیدۂ بینائے وطن تھی اور چشم شاعر، کسی عضو کے مبتلائے درد ہونے پر باوضو رہنے کو اپنی عبادت سمجھنے لگی [۷۰]۔

وامق جون پوری کے بعد ساحر لدھیانوی کی نظم کو بھی قحطِ بنگال کے ضمن میں عمدہ نظم شمار کی جانی چاہیے۔ ان کی انقلابی شاعری کی امتیازی شان اس کی روانی اور نغمگی ہے۔ ان کے ہاں گھن گرج بالکل نہیں۔ وہ ہنگامی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی شائستگی اور ضبط کے بندھن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے [۷۱]۔ ساحر نے ہمیشہ جبر و استبداد کے خلاف حق و صداقت کا پرچم بلند کیا۔ ان کا لہجہ قحطِ بنگال پر ترش ضرور ہوتا ہے، وہ غیظ و غضب کے عالم میں سوال ضرور کرتے ہیں لیکن کبھی بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ پوری نظم ''بنگال'' گویا ایک سوال نامہ ہے جس میں شاعر کے مخاطب وہی سیاست دان ہیں جو اس ساری صورتِ حال کے ذمے دار ہیں۔ اس نظم میں ساحر کی لفظیات کے اندر چھپی برق تپاں کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم محض احتجاج ہی نہیں بلکہ ایک زبردست سماجی طنز بھی ہے جس سے ایوانِ اقتدار دہل اُٹھا، نظم میں عوام کی زبوں حالی اور کس مپرسی کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے [۷۲]۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جہانِ کہنہ کے مفلوج سیاست دانو ں نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو		ملو ں کے منتظمو سلطنت کے فرزندو
یہ شاہ راہیں اسی وا سطے بنی تھیں کیا؟		کہ اس پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
ز میں نے کیا اسی کا ر ن انا ج اگلا تھا؟		کہ نسلِ آدم وحوا بلک بلک کے مرے [۴۳]

قحط کے بعد بھوکی، پیاسی مخلوق کا جمِ غفیر، پھٹی پھٹی آنکھوں والے نڈھال بچے جو غنودگی کے عالم میں سر ڈھلکائے ہوئے، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں، چہرے گرسنگی و تشنگی کی نقاہت سے مسخ کلکتے کی طرف دوڑ پڑے اب ہیبت ناک قحط کی زد میں آئے ہوئے بنگال اور بھوک سے سسک سسک کر مرنے والوں کی خبریں پورے ہندوستان میں پھیل رہی تھیں۔ روز بہ روز قحط کی ہول نا کی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔قحط سے سسک سسک کر مرنے والوں کی تعداد دوسری جنگِ عظیم میں مرنے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔گاؤں اور قصبوں میں موت نے چھاؤنی ڈال دی تھی۔آدمیوں کی کمریں خمیدہ ہو گئیں، عورتوں کی چھاتیاں سوکھ کر مردار گوشت کی طرح لٹک گئیں، بچوں کی پسلیاں تڑ مڑ کر اندر گھس گئیں اور پیٹ غباروں کی طرح پھول آئے۔اس حالت میں لوگ گھبرا کر ویران جھونپڑیوں سے نکل کر سڑکوں پر آ بیٹھے۔ان سڑکوں پر بھی وہ اکیلے نہ تھے، بلکہ ایک جہان تھا جو اِن کے ساتھ اُمڈ آیا تھا۔یہ بھوکے پیاسے لوگ موت سے لڑنے کلکتے کی سڑکوں پر پہنچ تو گئے لیکن یہاں بھی انھیں کچھ نہ ملا۔وہ نالیوں میں تیرتے مونگ پھلی کے چھلکوں، گوبھی کے پتوں اور گندگی کو کرید کرید کر پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے۔کارپوریشن کی کوڑے کرکٹ والی گاڑیوں پر چیلوں کی طرح جھپٹتے۔ایک دوسرے سے لڑتے، نوچتے، بال کھینچتے اور جب لڑلڑ کر نڈھال ہو کر سڑک پر گر جاتے تو لال پگڑی والے کارندے انھیں ٹانگوں سے گھسیٹ کر کنارے لگادیتے۔دریائے ہگلی پر اس دوران کئی ماؤں نے بچوں سمیت چھلانگ لگا دی [۴۴]۔ساحرؔ ایسے میں کبھی کبھی تلخ نوائی پر اُتر آتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں		کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خون سینچا تھا		کہ اِس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں [۴۵]

قدم قدم پر بھوک، افلاس، انسانیت کی آہ و بکا، بے گور و کفن نعشوں، زرد بچوں، بلکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر شاعر کی تلخ نوائی، دراصل اس معاشرتی ڈھانچے کے خلاف احتجاج ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت لاکھوں کروڑوں انسانوں کو کھائے جا رہی تھی۔نظم کا اختتام بھی اسی احتجاج پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ نظم قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالنے میں پوری طرح کامیاب رہتی ہے۔قاری نظم کی فضا میں گم ہو جاتا ہے گویا یہ نظم قحطِ بنگال کا منشور بن جاتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے		نظامِ نو کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے		بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں [۴۶]

ایک اور نظم پھر وہی کنجِ قفس میں بھی وہ مقتدر قوتوں کی بے حسی، رہبروں کی خود غرضی اور موت سے لڑتے بھو

کے ننگے انسانوں کی لاچاری پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں۔ایک بار پھر تند و ترش لہجے میں سوال کرتے ہوئے تہذیب کے رکھوالوں سے پوچھتے ہیں کہ:

میرے محبوب وطن میرے مقدر کے خدا
دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور مجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے
پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی ہے
پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے وہی بچوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کے لیے چھوڑ گئے
ارضِ بنگال! انھیں ڈوبتی سانسوں سے پکار
بول! چٹگاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول
بول اے پیپ سے رستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے بڑھے آتے ہیں طوفان
بول اے عفت و عصمت کے جنازوں کی قطار
روک ان ٹوٹتے قدموں کو انھیں پوچھ ذرا
پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک[۷۷]

امامی بنگلوری کی نظم بھوکا بنگال بھی اسی موضوع پر ایک موثر نظم ہے۔قحط کے دوران ہونے والی بدنظمی اور حکومتی لاپروائی کے نتیجے میں فوری طور پر اس صورتِ حال سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نظر نہیں رہی تھی۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ بنگال کو خاص طور پر اس حال تک پہنچا کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عوام کا قتل کیا جا رہا ہو۔امامی بنگلوری اس صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ تڑپ، یہ بھوک، یہ آہ و فغاں کچھ بھی نہیں
آنے والے دور کے کچھ ماہ و سال دیکھ[۷۸]

نظم میں سرمایہ دارانہ نظام کی خامیوں، ظلم و استیصال اور اس کے نتیجے میں بھوک کی ماری مخلوق کا حال بیان کرنے کے ساتھ وہ لوگوں کو غفلت سے بیدار ہونے اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا بھی درس دیتے ہیں:

آہ، اے سونے کی چڑیا! حیف اے ہندوستاں
تیری دنیا کس قدر ہے آج مالا مال دیکھ
اب بھی اے غافل وطن چشمِ خمار آلود کھول
بھوک سے ماری ہوئی مخلوق کا احوال دیکھ
تیرے دولتِ زار میں یہ قحط سالی آہ! آہ!
اور پھر چاروں طرف انسان کا احوال دیکھ
پی چکا مزدور کے دل کا لہو سرمایہ دار
ایک عالم ہو رہا ہے کس طرح پامال دیکھ[۷۹]

اس دور میں تلوک چند محروم کی شاعری بھی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار دکھائی دیتی ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں کا انداز بہت نمایاں ہے۔وہ ملک و قوم کی بربادی، قوم کی محکومی اور حکمران طبقے کی ستم گری سے بے حد کبیدہ خاطر تھے[۸۰]۔ان کے

خیال میں ہندوستان کو جس قدر بھی مصیبتوں اور بلاؤں نے گھیر رکھا ہے، اس کے ذمے دار انگریز ہیں۔ بنگال میں قحط سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی، اس پر بھی ان کا موقف یہی تھا کہ دورِ غلامی میں اس طرح کے سانحات سے بچاؤ ممکن نہیں۔ اگر ان سانحات سے مستقبل میں بچنا ہے تو آزادی کی لڑائی کو اور تیز کرنا ہوگا۔ اپنی نظم قحطِ بنگال میں وہ کہتے ہیں کہ:

غلامی میں نہیں ہے ان سے بچنے کا کوئی چارہ — یہ لڑتے ہیں جہاں سے اور ہم پر بوجھ ہے سارا
بچانے کے لیے اپنی جہاں گیری کا نقارا — ہماری کھال کھنچواتے ہیں دیکھو تو یہ نظارا
ہمارے دوست بھی کب ہیں جو ہیں جاپان کے دشمن — اسے بندوق سے مارا تو ہم کو بھوک سے مارا[۸۱]

وہ عالمی سطح پر ہونے والی سازشوں میں برطانوی کردار پر سخت تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں برطانیہ، عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔ اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے وہ ہندوستان کے لوگوں اور یہاں کے وسائل کو ایندھن کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ ہندوستان کی محکومی اور لاچاری کو اس بے بسی سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو قحطِ بنگال کی صورت میں رونما ہوئی۔ قحطِ ہند کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں وہ خدا سے شکوہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ دنیا میں بموں سے جو تباہی و بربادی، اور ہلاکتیں ہو رہی ہیں، بے شک ہندوستان اس سے بچا رہا لیکن بھوک سے تو نے اسے کیوں محفوظ نہیں رکھا۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ بھوک یہ رنج و تعب — لاکھوں کروڑوں جاں بلب
اتنا ستم ایسا غضب — آخر ہے کیا اس کا سبب؟
اس کا سبب وہ بے بسی — ممکن نہیں جس کا بیاں[۸۲]

بنگال کے ساتھ انگریزوں کے اس سلوک کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ آزادی کی تحریک میں اس صوبے نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ تقسیمِ بنگال اور دیگر فیصلوں کے ردِ عمل میں بنگال کے شدت پسندوں نے انگریزی اقتدار کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے بعد جب یہاں شدید ترین قحط آیا تو انگریزوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ماضی کی کارگزاریوں کا بدلہ یہاں کی عوام سے لے رہے ہیں۔ ایسے میں شاعر کبھی تو محض اشک سوئی کر کے اپنے دل پر گزرنے والی کیفیت کا اظہار قحطِ بنگال کے عنوان سے لکھے جانے والے قطعے میں کرتے ہیں:

بارش ہم سے اے وطن تو جو بچا تو کیا ہوا — قحط و وبا کے تیر ہیں، تیرے لیے قضا کے پاس
تیری مصیبتوں کی نذر، اشکِ رواں و داغِ دل — اس کے سوا ہے اور کیا، شاعرِ بے نوا کے پاس[۸۳]

اور کبھی اس تکلف دہ صورتِ حال پر تلخ نوائی پر اتر جاتے ہیں۔ اپنی اس تلخ نوائی کا اظہار وہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے کرتے ہیں:

اے مستِ بے خبری حال جہاں دیکھ — سرحدِ فنا ہے یہی پہنچا ہے کہاں دیکھ

کیا اہلِ وطن کا تجھے کچھ غم بھی نہیں ہے
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے

سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری
یہ جور ہے نا کر دہ گنا ہی پہ ہما ری

جس خطے سے اُٹھتی تھی صدا حبِ وطن کی
ملتی ہے اسے آج سزا حبّوطن کی

ٹوٹا نہ اگر حلقۂ ز نجیرِ غلا می
اس سے بھی خطرنا ک ہے تقدیرِ غلامی[۸۴]

انھوں نے اس طرح کی سیاسی نظموں کے ذریعے ''ہندستانیوں کو فتح وشکست، آزادی کے نشیب وفراز اور حاکم ومحکوم کے تعلقات پر شاعرانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے[۸۵]۔'' وہ حریت پسندانہ جذبات رکھنے کے باوجود کبھی ظلم وتشدد کی راہ اپنانے کا پیغام نہیں دیتے۔ ان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ قوم غفلت سے بے دار ہو جائے۔ قحطِ بنگال کے پس منظر میں بھی وہ اسی اصلاحی پہلو کو اپنے سامنے ضرور رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے اشعار کا رنگ دیکھیے:

خوں خوار بلائیں ہیں ترے سامنے غا فل
قحط اور وبائیں ہیں ترے سا منے غا فل

کیا اہلِ وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے

افسا نہ عبر ت ہو ئی و یرا نی بنگال
مذ کو ر کہن ہے چمنستا نی بنگا ل

سڑ تی ہیں پڑی کو چہ و با زار میں لاشیں
ہیں نقشِ طرف دیدۂ اغیار کی لاشیں[۸۶]

محرومؔ کی شاعری کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کی بھرپور ترجمانی ونمائندگی کی۔ زندگی کے نشیب و فراز کی ترجمانی کرتے ہوئے انھوں نے ایک دردمند انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی دردمندی کی وجہ سے وہ قوم کی زبوں حالی پر ہمیشہ نوحہ خواں رہے[۸۷]۔ مخدوم محی الدین بھی علی سردار جعفری کی طرح رزمیہ مزاج اور عسکری لہجے کے مالک ہیں[۸۸]۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہی انقلاب ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ایک للکار اور گھن گرج کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ قحطِ بنگال کی مناسبت سے لکھی گئی نظم بنگال میں بھی وہ اسی گھن گرج کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک ہو کر دشمن کے عزائم خاک میں ملانے کا مشورہ دے رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خو ن کا بھر پور دریا پا ر کر سکتے ہیں ہم

کا نگر یس کو لیگ کو بے دار کر سکتے ہیں ہم
ز ند گی سے ہند کو سر شار کر سکتے ہیں ہم

وہ درِ ہندو ستا ں وہ سحر و نغمہ کا د یار
د ید نی ہے آج اس کی نا تو انی کی بہا ر

بھوک کا بیما ریوں کا بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جا پا ن کا خنجر تو سر پر سُو د خوا ر

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خو ن کا بھر پور دریا پا ر کر سکتے ہیں ہم[۸۹]

قحط کے نتیجے میں موت کا رقص، بے شمار لاشیں، سوکھی چھاتیوں کے چمٹے بلکتے بچے اور فاقے کا شکار بھوکی ننگی عوام کو اس حال تک پہنچانے والے ذمے داروں کی بابت وہ سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

قبر سے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے

خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھر پور دریا پار کر سکتے ہیں ہم

امتِ مرحوم ہو یا ملّت زنّاردار
ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار

مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ! سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچوں کی پکار

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھر پور دریا پار کر سکتے ہیں ہم[۹۰]

احمق پھپھوندی کی شاعری بھی ظرافت کے پردے میں ہماری قومی غیرت کو بے دار کرتی ہے۔ ان کے ہاں بھی ملک و قوم کا گہرا درد موجود تھا۔ احمق کی نظر مانچسٹر کی ملوں اور لندن کی کونسلوں تک پہنچی جن کے معاشی اور سیاسی استبداد نے ہندوستان کو بھوگا اور کنگال بنا دیا تھا[۹۱]۔ اس پس منظر میں لکھی متعدد نظمیں غلام ہندوستان کے افراد کے دلوں کی آواز معلوم ہوتی تھیں۔ ہندوستان کی دولت و حشمت پر انگریز حکم رانوں نے جس طرح قبضہ جمایا اور اس قبضۂ اغیار کی وجہ سے جس طرح ہمارے دست کار بے کار ہوئے کھلیان سُونے اور دھرتی کو جس طرح حکم رانوں نے بانجھ کیا، احمق نے یہ سارے مناظر اپنی شاعری میں پیش کیے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

مرتے ہیں ہر سال فاقے سے کروڑوں آدمی
ہند پر برٹش کے احسانات کو دیکھو ذرا

تو اپنی بھوک کا شاکی فضول ہے اے ہند
مریض کو یوں ہی فاقے کرائے جاتے ہیں

ہماری بے حسی نے گو رتک پہنچا دیا آخر
کفن بھی اب تو ہم کو مانچسٹر مِل سے ملتا ہے[۹۲]

روش صدیقی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن غزل کی قدیم روایت کی پاس داری کی وجہ سے ان کی نظموں میں بھی تغزل کی فضا چھائی رہتی ہے[۹۳]۔ قحطِ بنگال کے عنوان سے لکھی گئی طویل نظم میں بھی یہی خوبیاں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔ نظم کا ابتدائی انداز دیکھنے سے ہی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

چاندنی راتوں کو مصروفِ فغاں پاتا ہوں میں
صبح کے چہرے کو زرد و ناتواں پاتا ہوں میں

دوش پر گلیوں کی ایک کوہِ گراں پاتا ہوں میں
منتشر سا زندگی کا کارواں پاتا ہوں میں

جاگتا ہے صبحِ دم خورشید تھرا تا ہوا
عظمتِ کاشانۂ آدم سے گھبرا تا ہوا

کس نے انجم سے ردائے شادمانی چھین لی
رس بھری راتوں سے جنت کی کہانی چھین لی

صبح سے کس نے ادائے گل فشانی چھین لی
کس نے وہ تصویرِ خلدِ جاودانی چھین لی

کس نے حسنِ زندگی کو مرگِ ساماں کر دیا
جنتِ بنگال تجھ کو دشتِ ویراں کر دیا[۹۴]

روشؔ، برعظیم میں سامراجی استعمار کے خاتمے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ فرنگی تہذیب و تمدن کے خاتمے کے آرزو

مند تھے کیوں کہ ان فرنگی حکم رانوں نے ہی برصغیر میں ظلم و بربریت کے نت نئے طریقے ایجاد کیے تھے۔ کبھی مقامی صنعتیں تباہ کرنے کے لیے دست کاروں کے ہاتھ کٹوائے تو کبھی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لیے قحط کی صورتِ حال پیدا کر کے حریتِ فکر کے پرچم کو سرنگوں کرنے کا سامان پیدا کیا گیا۔ اس منظر نامے کے بیان میں روش کا کہنا تھا کہ:

با ہنر صنعت گروں کے ہاتھ کٹوائے گئے — کاسہ سر شدّتِ نفرت سے ٹھکرائے گئے
بے محابہ کوچہ و بازار لٹوائے گئے — خونِ انساں کے لبالب جام چھلکائے گئے
شاد تھا ابلیس یہ کارِ نمایاں دیکھ کر — خوں بھرے ہاتھوں میں کلیوں کا گریباں دیکھ کر
حریت کے تند شعلوں کو بجھانے کے لیے — روحِ آزادی کے پرچم کو جھکانے کے لیے
حیلہ شیطاں کا جادو آزمانے کے لیے — چشمِ بد بیں نے مجھے تاکا نشانے کے لیے
پھر غلامی قحط کے بہروپ میں لائی گئی — زندگی کو موت کی زنجیر پہنائی گئی[۹۵]

نظم کے اس حصے میں روشؔ نے بڑے جذباتی انداز سے قحط کی تباہی اور وحشتوں کو پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق قحط سے بڑھ کر کوئی اور مصیبت نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

قحط ظالم قحط، آشوب قیامت آفریں — خاک برساتا ہے گردوں خوں اگلتی ہے زمیں[۹۶]

اس کے بعد قحط کی ہلاکتوں اور استعماری رویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شیطانی منصوبہ بنگال کے لیے بنایا گیا تھا، دشمن اس میں پوری طرح کامیاب رہا۔ اس قحط نے ہر طرف انسانیت کی شرمندگی کے سامان پیدا کیے۔ فاقوں نے کتنے ہی بچوں سے زندگی چھین لی، بچیوں کی آبرو لوٹ لی، نوجوانوں کو لاغر اور نڈھال کر دیا یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ شاعر نے ان مناظر کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

کارگر شیطاں کا افسونِ تظلّم ہوگیا — دانہ دانہ خرمنِ بنگال سے گم ہو گیا
موت کے جبڑوں میں خالی پیٹ سوکھے سے بدن — ہڈیوں کے بیچ میں الجھا سا ربطِ جان و تن
زندہ لاشوں کے لیے پردہ نہ مردوں کا کفن — آفریں صد آفریں! اے سامری مرگ من
پی لیا فاقوں نے کتنے نوجوانوں کا لہو — لُٹ گئے غربت میں کتنے کاروانِ رنگ و بو
کتنی کلیاں ہو گئیں محرومِ شمع آبرو — بے کسی نے زہر آلودہ کیے کتنے سبو
زندگی یہ ماجرا غاصب نگہ بانوں سے سُن — تاب ہے تجھ میں تو خود مظلوم انسانوں سے سن
کتنے بچے بھوک کے شعلوں کا ایندھن بن گئے — نوجواں کتنے شکارِ برقِ خرمن بن گئے
کتنے مسکن زندہ انسانوں کا مدفن بن گئے — جو نگہ باں تھے وہی بے درد راہ زن بن گئے[۹۷]

روش کا کہنا ہے کہ اس قحط کے سدِ باب کے لیے کوشش نہیں کی گئی۔ ظاہری بات ہے کہ برطانوی راج میں ہونے والی ہلاکتوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کی زندگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ انھیں صرف اپنی غلامی میں رکھنا پسند کرتے تھے۔ ان کے مسائل اور مصائب کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ انگریز سامراج کے اس رویے پر خود مغرب کے لکھنے والوں نے بھی سخت تنقید کی تھی۔ روش اس بابت کہتے ہیں کہ:

خونِ آدم روئے افرنگی کا غازہ شرم ہے آدمی ہو آدمیت کا جنازہ شرم ہے
خواجگانِ زرنئی جنت سجائیں روز و شب فاقہ کش روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پائیں روز و شب
اس شقاوت پر فریبِ غم گساری شرم ہے شرم ہے لعنتِ سرمایہ داری شرم ہے[۹۸]

شاعر یہاں سرمایہ دارانہ نظام کے تحت فرنگیوں کی ہوسِ زر کی طرف تو اشارہ کر ہی رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ قحط کی جو تلوار بنگال پر مسلط کی گئی تھی وہ مشرق کی خوش حالی کو دیکھ کر مسلط کی گئی تھی۔ ان کے خیال میں:

دیکھ کر آزادیٔ مشرق کا گہوارہ مجھے بزدلوں نے قحط کی تلوار سے مارا تجھے[۹۹]

لیکن اب اس کیفیت سے نکلنے کی کوئی سبیل خود شاعر کو بھی سجھائی نہیں دیتی۔ وہ قحط کی ہولناکی پر متفکر اور پریشان تو ہیں۔ اپنی ایک اور نظم تازیانہ میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں:

بہت ملال ہے تجھ کو کہ سرزمینِ وطن بلائے قحط و صد آفات کا نشانہ ہے
مجھے بھی غم ہے کہ آرام و خلد کا مسکن عذابِ آتشِ دوزخ کا آشیانہ ہے
اداس بھوک کے پنجر، برہنگی محجوب کدھر یہ قافلہ بے کسی روانہ ہے[۱۰۰]

پڑوس کے صوبے کی بے اعتنائی، مصیبت کا شکار لوگوں کی اعانت سے انکار، صوبائی اور مرکزی حکومت کی تاویلیں، امرا اور مقتدر حلقوں کے بے حسی وغیرہ جیسے تمام اہم معاملات کو اس نظم میں قلم بند کیا گیا ہے۔ جیسے:

الٰہی شفقتِ ہم سایہ ہے کہاں روپوش یہاں تو نالہ تنہا چراغ خانہ ہے
نصیب فاقہ کشاں زہر بھی نہیں ہے جہاں کھلا ہوا وہیں بابِ شراب خانہ ہے
یہاں تباہ ہے خلقِ خدا وہاں اب تک گہر فشانی تاویل واعظانہ ہے
ہوا ہے تکملہِ انتباہِ بے داری یہ قحط ہند کی غفلت پہ تازیانہ ہے[۱۰۱]

کیفی اعظمی کی شاعری میں بھی اشتراکی نظریہ پوری طرح اثر انداز ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے وثوق کے ساتھ ظلم و جور پر مبنی سامراجی نظام کے خلاف آوازِ حق بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذکور صفحات میں سرت چندر بوس کے حوالے سے ذکر کیا گیا کہ کس طرح وہ جاپان کے ساتھ مل کر ہندوستانی استعمار کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اسی تناظر میں کیفی اعظمی

کی نظم برما کے چاول ایک خاص تاریخی اور حربی پس منظر لیے ہوئے ہے۔ بوس نے جس طرح آزاد ہندوستان کا نعرہ بلند کیا، شاعر نے ابتدا میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ:

چمن سے دور اثمارِ چمن بھجوائے جاتے ہیں جو بھجوانے سے ڈرتے ہیں وہ فوجی کھائے جاتے ہیں
تمھارا دانے دانے کو ترسنا دل دکھاتا ہے فضا پیدا کرو ہم لے کے چاول آئے جاتے ہیں ۱۰۲

اس کے بعد نظم کے اگلے حصے میں بھوکے بنگال کا جواب کے عنوان سے وہ محبِ وطن ہندوستانیوں کے خیالات قلم بند کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح سے مخالفین کو خوش آمدید کہہ کر وہ دراصل فسطائیت کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ وہ اس پیش کش کو ٹھکرا دیتے تھے۔ انھیں وطن کی آبرو بیچ کر پیٹ کی آگ بجھانا گوارا نہیں۔ وہ عزت کے ساتھ مرنا تو گوارا کر سکتے ہیں۔ لیکن ضمیر کا سودا نہیں کر سکتے۔ نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

زمین ہند پر اب جا ل تم پھیلا نہیں سکتے یہ مکاری کی باتیں ہیں ہم اِن میں آ نہیں سکتے
وطن کو پیٹ پر قربان کرنا غیر ممکن ہے جو غیرت دار ہیں گھر بیچ کر وہ کھا نہیں سکتے
تمھارے زہر آگیں چاولوں میں خون کی بو ہے مبارک ہو تمھیں ہم تاب ان کی لا نہیں سکتے
ہمیں ہندوستان کے ذرے ذرے سے محبت ہے یہاں تم پرچم فسطائیت لہرا نہیں سکتے ۱۰۳

اسی طرح شبھاس چندر بوس بہادر شاہ ظفر کے مزار پر کے عنوان سے لکھی گئی ایک نظم میں بھی جگن ناتھ آزاد نے قحطِ بنگال کے پس منظر میں یہ شعر قلم بند کیا:

اپنے بھولے جاں بلب بنگال کی مجھ کو قسم حاکموں کے دست پرور کال کی مجھ کو قسم ۱۰۴

شاعر نظامی نے نالہ مشرقی بنگال کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی دو شعر قحطِ بنگال کے پس منظر میں لکھے۔ ان اشعار میں انسانی بے حسی اور طبقاتی تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اِک سمت میں بھوکوں کے لرزتے ہوئے کاسے اِک سمت میں پتھر میں ڈھلے قاسم و رزاق
انسان بھی انسان کو روٹی نہیں دیتے حیران ہے یہ سنگ دلی دیکھ کے رزاق ۱۰۵

میلا رام وفا نے بھی انگریز سامراج کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔ نظم اے فرنگی میں وہ ہندوستان میں انگریز کی آمد کو سبز قدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو آج تک جس قدر بھی سانحات سے گزرنا پڑا، وہ اس کے پس و پشت انگریزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اے فرنگی! کبھی سوچا ہے یہ دل میں تو نے اور یہ سوچ کے کچھ تجھ کو حیا آئی ہے
نا مبارک تھا بہت ہند میں آنا تیرا قحط آیا تیرے ہم راہ و با آئی ہے
تیرے قدموں سے لگی آئی غلامی ظالم ساتھ ہی اس کے غریبوں کی بلا آئی ہے

دور افلاس کا نیزو ں سے کیا تو نے علا ج　　موت بن کر تیرے ہاتھوں میں شفا آئی ہے
اس رو ش پر کبھی اے بانیِ بے داد تجھے　　دل کے اندر سے ملا مت کی صدا آئی ہے[۱۰۶]

اس نظم کی پاداش میں برطانوی حکومت نے انھیں گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور دو برس قید کی سزا بھی سنائی[۱۰۷]۔فرقت کاکوروی نے بھی قحط کے پس منظر میں بنگال کی رقاصہ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں قحط کے زمانے اور بعد میں بنگال میں اخلاقی بحران کی کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔قحط نے جس طرح عورتوں کو جسم فروشی پر مجبور کیا، اس کی جھلک اس نظم میں دیکھی جا سکتی ہے ملاحظہ کیجیے:

ناچے ناچے پائل کے بغیر
جسم عریاں ہی رہے
شعلہ افشاں ہی رہے
ناچے ناچے پائل کے بغیر
بھوک اور موت کا رقص
میرے بنگال کا رقص
ناچے سوچتی کیا ہیں اٹھیے
آپ بنگال سے کب آتی ہیں
نغمہ و رقص کا پیکر بن کر
جسم کو بیچتے پتھر بن کر[۱۰۸]

آنند نرائن ملا نے بھی قحطِ کلکتہ کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔اس نظم میں بھی قحط کے زمانے کی چور بازاری، استعمار کے مکروہ ہتھکنڈے اور اس کے نتیجے میں قحط کی صورتِ حال کو موثر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

ہے مگر قہر یہ بے بلا ئی ہو ئی موت　　نا تو اں پہ نا تواؤ ں کی لا ئی ہو ئی موت
شہہ نشینوں سے زمینوں پہ گرائی ہوئی موت　　چور بازار کے سکو ں کی چلائی ہوئی مو ت
قتل کر دے کسی بے کس کو ہلا کو جیسے　　لو ٹ لے خا نہ بیوہ کو ئی ڈا کو جیسے[۱۰۹]

آنند نرائن ملا کے لیے انسان دوستی کوئی شاعرانہ موضوع نہیں، بلکہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے[۱۱۰]۔اسی لیے وہ بڑی تعداد میں ہونے والی ہلاکتوں اور شہر کی ویرانی پر سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔قحط کے بعد وہ کلکتے کی بے رونقی پر دل گرفتہ ہو کر یہ کہتے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

آج سنسان اسی شہر کی ہر بستی ہے　　عرصۂ جنگ سے بھی موت وہاں سستی ہے[۱۱۱]

اشفاق احمد کی شناخت یوں تو ڈراما اور افسانوی ادب میں مسلّم ہے لیکن ان کا شعری ذوق بھی کافی بلند ہے۔ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے سماجی اور سیاسی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں پر وہ گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کئی نظمو ں میں قحطِ بنگال کو موضوع بنایا ہے۔ یہ نظمیں فکر و خیال کے اعتبار سے عمدہ نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ نوجوانی میں ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کرنا ان کی پختہ فکر کی علامت ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں کوی، اب کی دیوالی، پیروان ہلاکو کی لاشیں اور پومپیائی وغیرہ خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ نظم کوی میں قحطِ بنگال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اذیت ناک صورتِ حال کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے[۱۱۲]، کوی نے چوں کہ قحط کے سارے مناظر آنکھوں سے دیکھے ہیں لہٰذا اس کی ہیبت ناکی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی نیند تک اس سے روٹھ گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

آج کوی کی آنکھوں میں کیوں نیند کے سوتے سوکھ گئے؟ آج اس نے دھرتی کے سینے پر خون کے دھارے دیکھے ہیں
ننگے روگی دیکھے ہیں کہ بھوک کے مارے دیکھے ہیں یا گرتے بنگالی اِک چاول پر سارے دیکھے ہیں؟
یا مزدورو کی آشاؤں پر چلتے آرے دیکھے ہیں جلتا تو ہے اس کی کٹیا میں دیپک پر کھپ سا ہے؟
کیسی سوچ میں ہے آخر وہ آج بھلا کیوں چپ سا ہے؟ آج کوی کی آنکھوں میں کیوں نیند کے سوتے سوکھ گئے؟[۱۱۳]

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بنگال میں آنے والے قحط نے سسکتی، بلکتی انسانیت کی ایسی ہول ناک تصویر پیش کی کہ فن کاروں کے ذہنوں پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا۔ لہٰذا ایک شاعر کی ذہنی حالت اس واقعے کے بعد کیا ہوسکتی ہے؟، اس کا عمدہ منظر نامہ مذکورہ نظم میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور موثر نظم پیروانِ ہلاکو کی لاشیں ہے۔ مکالمے کی صورت میں آگے بڑھتی یہ نظم مچھر کے مکالمے سے شروع ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مکالمہ ایک بڑے مسئلے کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ قحطِ بنگال کے نتیجے میں لوگوں کے بدن اس قدر لاغر اور بے جان ہو چکے ہیں کہ مچھر بھی اس بدن سے ایک بوند خون چوس کر اپنی پیاس نہیں بجھا پا رہا ہے[۱۱۴] اس کمزوری اور لاغری کو دکھاتے ہوئے شاعر کے ذہن میں ضرور وہ زندہ لاشیں ہوں گی جو لاکھوں کی تعداد میں نقاہت اور کمزوری کے باعث کلکتہ کی سڑکوں پر مر گئے۔ شاعر یہ منا ظر دکھاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

خوں کی اِک بوند بھی بھو کے نہیں دے سکتے ہائے! اس ملک کی غیرت کہاں جا ٹپکی ہے؟
اب بھی بنگال کی لاشوں کا گلہ ہو گا کیا؟ اور تو اور یہ مچھر کو بھی دیتی ہیں جواب
ہائے! اس ملک کی غیرت کہاں جا دبکی ہے؟ اور اس ملک کا ہر پیرو جواں مجرم ہے
میں نے اس جنگ میں دس پونڈ لہو بیچ دیا اب بھی آتی ہے مرے ہاتھ سے خوش بو دیکھو[۱۱۵]

یہاں معاشرے کی بے حسی پر چوٹ کی گئی ہے۔ اسی طرح فضا اعظمی نے بھی اپنی مثنوی ''زوالِ آدم'' میں قحطِ بنگال کے تناظر میں سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں پر معصوم انسانوں کا خونِ ناحق کا ذمے دار ملک گیری کی ہوس کرنے والوں کو ٹھہرا

یا گیا ہے۔ وہ قحط کے نتیجے میں تہذیب کی غارت گری، اخلاقی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی پستی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہمارے اندر گہری مایوسی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ گہری مایوسی اور المیے کا احساس نظم کے تار پود میں از اوّل تا آخر موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

تم نے اس دہر کو پاتال بنا رکھا ہے　　بھوک اور پیاس سے سڑکوں پہ تڑپتے ہوئے لوگ
قحط و افلاس کی چکی میں سسکتے ہوئے لوگ　　ملک گیری کی ہوس کے لیے لڑتے ہوئے لوگ
تشنگی آج ہے انسان کی قسمت کی لکیر　　چاہِ بے آب پہ ایستادہ ہے پیاسوں کی بھی[۱۱۶]

غرض کہ قحطِ بنگال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ بھوک کے مسئلے کو جس قدر اچھالا گیا، اس کی نظیر تاریخ کے کسی اور دور میں نہیں ملتی۔ یہ ایک اقتصادی مسئلہ تھا، شعرا نے اس اقتصادی مسئلے کو بھرپور طریقے سے تخلیق کا موضوع بنایا۔ اس سانحے کے بعد بھوک اور غربت کا ذکر اردو شاعری میں تواتر سے ہونے لگا۔ اس حوالے سے ترقی پسند نظریات کے حامل شعرا نے زیادہ موثر کردار ادا کیا اور زندگی کے افادی پہلوؤں کی طرف بھرپور توجہ دلائی۔

حوالہ جات:

۱۔ احمر، فروغ، اکتوبر ۱۹۵۵ء، مشرقی پاکستان تاریخ اور جائزے، مشمولہ: 'تعمیرِ انسانیت'، لاہور، ص ۴۳۔۴۰
۲۔ محمود الرحمن، ۱۹۸۶ء، جنگِ آزادی کے اردو شعرا، قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ص ۱۶۔۱۵
۳۔ ''پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی'' ص ۳۰۳ بہ حوالہ: محمود الرحمن، محولہ بالا ص ۳۱
۴۔ ایضاً، ص ۳۶۔۳۵
۵۔ نارنگ، گوپی چند، ۲۰۰۳ء، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، ص ۲۸۷۔۲۸۶
۶۔ ملیح آبادی، جوشؔ، ۲۰۰۷ء، ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب، مشمولہ: 'نغماتِ حریت'، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم و شمس الرحمن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، ص ۲۴۔۲۳
۷۔ صدیقی، شمیم احمد، اکتوبر ۱۹۵۵ء، مشرقی پاکستان کی صنعتیں، مشمولہ: 'تعمیرِ انسانیت'، لاہور، ص ۱۰۵
۸۔ بہ حوالہ Attp:// en.wikipedia.org,wiki Great B.
۹۔ مائیک، وائس (WiseMike)، ۲۰۰۰ء، *Late Victorian Holocausts:Et Nino Famines and the Making of the third world*، ورسو، یو کے
۱۰۔ سندھو، سکھ دیو (Sukhdev Sandhu)، ۲۰ر جنوری ۲۰۱۱ء، بہ حوالہ *The Guardians* برطانیہ
۱۱۔ ڈیوس، مائیک، جنوری ۲۰۱۱ء، (Mike, Davis) *The Guardians*، برطانیہ
۱۲۔ دت، رمیش (Romesh Dutt)، سن ندارد، *Economic History of India*، جلد ۱، لندن، ص ۳۵
۱۳۔ ملک، اے آر، ۱۹۶۱ء، *British policy and Muslims in Bengal*، ڈھاکا، ص ۷۹

۱۴۔ صدیقی، اسرار احمد، ''پوسٹ'' debunking- athesim.blogspot.com
۱۵۔ چودھری، زاہد، بنگالی مسلمانوں کا تحریکِ پاکستان میں نمایاں ترین کردار، ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور، ص ۶۱۔۵۹
۱۶۔ صدیقی، اسرار احمد، محولہ بالا
۱۷۔ ٹکر، ہنری سینٹ جارج، ۱۸۵۳ء، *Memorials of the Indian Govt. being a selection from the papers* لندن، ص ۴۹۴
۱۸۔ صدیقی، اسرار احمد، محولہ بالا
۱۹۔ بہ حوالہ رپورٹ بی۔بی۔سی http://www.bbc.com/urdu/world
۲۰۔ سنہا، این۔کے، ۲۰۰۱ء، بہ حوالہ: جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی، از مشیر الحسن، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ص ۱۳۶
۲۱۔ بہ حوالہ: رپورٹ بی۔بی۔سی، محولہ بالا
۲۲۔ مشیر الحسن، ۲۰۰۱ء، جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ص ۱۳۶
۲۳۔ پریم گھن، بدری نرائن، بہ حوالہ: جان کمپنی سے جمہوریہ تک، محولہ بالا، ص ۱۳۷
۲۴۔ چودھری، زاہد، ص ۲۹۱
۲۵۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ۱۹۶۵ء، آزادیِ ہند، مترجم: رئیس احمد جعفری، مقبول اکیڈمی، لاہور، ص ۳۶۸۔۳۶۲
۲۶۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۲۹۲۔۲۹۱
۲۷۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ۱۹۸۸ء، تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ص ۵۸۹۔۵۸۸
۲۸۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۳۱۹۔۲۹۲
۲۹۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ، ۱۸ مئی ۱۹۴۳ء، لاہور
۳۰۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۳۳۳۔۳۹۲
۳۱۔ نارنگ، گوپی چند، ص ۴۰۶
۳۲۔ علوی، حمزہ، ۲۰۱۴ء، تخلیقِ پاکستان: تاریخی و سماجی مباحث، مترجم: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۵۸
۳۳۔ نارنگ گودلی چند ص ۴۰۶
۳۴۔ چودھری، زاہد، ص ۳۳۶۔۳۳۵
۳۵۔ ایضاً، ص ۳۴۰
۳۶۔ ہری داس، مجمدار، ۱۹۴۴ء، *Shadow of Famine*، ص ۱۳
۳۷۔ چودھری، زاہد، ص ۳۴۲۔۳۴۲
۳۸۔ ایضاً، ص ۳۵۰۔۲۴۳
۳۹۔ بہ حوالہ، قحط/http:// ur.wikipedia.org/wiki
۴۰۔ مکرجی، مدھوسری، *Churchill's Secrets War*، بہ حوالہ: انکشافات/http:///www.dw.com/ur
۴۱۔ ملیح آبادی، جوشؔ، کسان، https:www.rekhta.org/nazms/kisan.
۴۲۔ _____، ۴۰۰۴ء مستقبل، بہ حوالہ: 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'، از: سید مجاور حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ،

ص۳۸۶

۴۳۔ ______، ۱۹۴۱ء مشمولہ: آیات نغمات، مکتبہ اردو، لاہور، ص ۲۲۲

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔۲۵۳

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔۲۵۵

۴۶۔ ملیح آبادی، جوشؔ، ۱۹۴۱ء، مشمولہ: حرف و حکایت، مکتبہ اردو، لاہور، ص ۱۲۸

۴۷۔ حسین، سید مجاور، ۱۹۸۵ء، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، اُتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ص ۳۸۷۔۳۸۶

۴۸۔ اعظمی، ڈاکٹر منظر، ۲۰۰۹ء، اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رحجانوں کا قصّہ، اُتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ص ۳۶۹۔۳۶۸

۴۹۔ جعفری، علی سردار، ۲۰۰۴ء، بنگال، مشمولہ: کلیات علی سردار جعفری، جلد اوّل، مرتبہ: علی احمد فاطمہ، قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان، دہلی، ص ۱۰۷

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۵۴۔ جعفری، علی سردار، ۲۰۰۶ء، کلیات علی سردار جعفری، جلد دوم، مرتبہ: علی احمد فاطمہ، قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان، دہلی، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۵۵۔ ______، ۱۹۵۲ء، ایشیا جاگ اُٹھا، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ص ۱۲۸۔۲۷

۵۶۔ اکبر آبادی، سیماب، ۱۹۴۷ء، بھوکا ہندوستان، مشمولہ: 'شعرِ انقلاب'، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ص ۱۱۰

۵۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۵۸۔ ______ ۱۹۴۳ء، عالمِ آشوب، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ص ۳۳۷

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۶۰۔ اکبر آبادی، سیماب، عالمِ آشوب، محولہ بالا ص ۴۱۰

۶۱۔ مراد آبادی، جگر، سن ندارد، قحطِ بنگال، مشمولہ: 'کلیاتِ جگر'، مرتبہ، کرشن کانت، آزاد بک ڈپو، امرت سر، ص ۲۷

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ حسین، سید احتشام، ۱۹۵۰ء، پیش لفظ، مشمولہ: 'جرس'، از وامق جون پوری، دانش محل، لکھنؤ، ص ۱۰۔۶

۶۵۔ جون پوری، وامق، ۱۹۵۰ء، جرس، دانش محل، لکھنؤ، ص ۱۲۳

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔۱۲۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۶۸۔ شہاب، قدرت اللہ، ۱۹۹۹ء، شہاب نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۲۲۹۔۲۳۰

۶۹۔ شفائی، قتیل، قتیل شفائی کی آپ بیتی: قسط نمبر ۱۰۶، بہ حوالہ https://dailypakistan.com.pk.

۷۰۔ حسین، سید مجاور، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، محولہ بالا ص ۳۹۵

۷۱۔ نارنگ گوپی، چند ص ۴۱۱
۷۲۔ جعفری، ڈاکٹر مسعود، ساحر کی شاعری میں صدائے احتجاج، بہ حوالہ:
http://urdu.siasat.com/news/671383
۷۳۔ لدھیانوی، ساحر، بنگال، بہ حوالہ: http://www.rekhta.org/nazms/bangal
۷۴۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، محولہ بالا، ص ۲۲۱۔۲۱۷
۷۵۔ لدھیانوی، ساحر، محولہ بالا
۷۶۔ ایضاً
۷۷۔ لدھیانوی، ساحر، ۱۹۹۵ء، پھر وہی کنجِ قفس، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۱۱۰
۷۸۔ بنگلوری، امامی، ۱۹۵۶ء، خشیتِ خوں، انجمنِ ترقی اردو، بنگلور، ص ۱۱۳
۷۹۔ ایضاً
۸۰۔ محمود الرحمن ''محولہ بالا ص ۳۲۵
۸۱۔ محروم، تلوک چند، ۱۹۶۰ء، قحط بنگال، مشمولہ: 'کاروانِ وطن'، مکتبہ جامعہ، دہلی، ص ۲۵۵
۸۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴
۸۳۔ ایضاً، ص ۲۵۶
۸۴۔ محروم، تلوک چند، ۱۹۶۰ء، قوم سے خطاب'، بہ حوالہ: 'تلوک چند محروم'، مرتبہ: جگت ناتھ آزاد، انجمنِ ترقی اردو ہند، دہلی، ص ۱۶۵
۸۵۔ جاوید، ڈاکٹر زینت اللہ، ۱۹۹۷ء، تلوک چند محروم: شخصیت اور فن، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، دہلی، ص ۱۶۵
۸۶۔ محروم، تلوک چند، کاروانِ وطن، محولہ بالا ص ۲۵۷۔۲۵۶
۸۷۔ بہزادی، کامل، ۱۹۹۷ء، تلوک چند محروم: ایک مطالعہ، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی، ص ۲۵۔ ۲۴
۸۸۔ گورکھپوری، مجنوں، ۱۹۷۰ء، پچیس سال کی چند اہم شخصیتیں، مطبوعہ افکار، جوبلی نمبر، کراچی، ص ۶۹
۸۹۔ محی الدین، مخدوم، ۱۹۶۶ء، بنگال، مشمولہ: 'بساطِ رقص'، استقبالیہ کمیٹی جشن مخدوم، حیدر آباد دکن، ص ۱۱۵
۹۰۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔۱۱۶
۹۱۔ نارنگ، گوپی چند، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، محولہ بالا ص ۴۱۵۔ ۴۱۴
۹۲۔ پھپھوندی، احمق، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری''، محولا بالا ص ۴۱۵
۹۳۔ کاظمی، روشن اختر، ۱۹۸۴ء، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۲۷۵
۹۴۔ صدیقی، روش، ۱۹۱۳ء، افسوسِ تکلّم، کتاب بھون، دہلی، ص ۱۸۷
۹۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔ ۱۹۲
۹۶۔ ایضاً، ص ۱۹۴
۹۷۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔ ۱۹۵
۹۸۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔ ۱۹۶
۹۹۔ ایضاً، ص ۱۸۷
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۹۷
۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔ ۱۹۸

۱۰۲۔ اعظمی، کیفی، سن ندارد، برما کا چاول، مشمولہ: 'جھنکار'، قومی دارالاشاعت، بمبئی، ص ۱۱۵
۱۰۳۔ ایضاً
۱۰۴۔ آزاد، جگن ناتھ، شبھا س چندر بوس، بہادر شاہ ظفر کے مزار پر، مشمولہ: 'اردو میں قومی شاعری کے سو سال'، محولہ بالا، ص ۱۷۳
۱۰۵۔ نظامی، ساغر، ۱۹۹۸ء، کلیاتِ ساغر نظامی، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۱۷۱
۱۰۶۔ وفا، پنڈت میلا رام، اے فرنگی، بہ حوالہ: https://rekhta.org/shayari
۱۰۷۔ سہیل، احمد، میلہ رام وفا، بہ حوالہ: https://www.facebook.com نیز http://rekhta.org/shayari
۱۰۸۔ کاکوروی، فرقت، بنگال کی رقاصہ، بہ حوالہ: http://rekhta.org.shayari
۱۰۹۔ ملا، آنند نرائن، ۲۰۱۰ء، قحطِ کلکتہ، مشمولہ: 'کلیاتِ آنند نرائن ملا'، مرتبہ: خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، ص ۲۵۶
۱۱۰۔ انجم، خلیق، پیش لفظ، مشمولہ: 'کلیاتِ آنند نرائن ملا'، محولہ بالا ص xv.
۱۱۱۔ ملا، آنند نرائن، ص ۲۵۵
۱۱۲۔ صدف، ڈاکٹر شازیہ، اشفاق احمد کی ادبی خدمات اردو ادب کے تناظر میں، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، جامعہ پنجاب، ص ۱۴۷
۱۱۳۔ احمد، اشفاق، کون، بہ حوالہ: 'اشفاق احمد کی اردو شاعری'، محولہ بالا ص ۱۷۴۔۱۷۵
۱۱۴۔ صدف، ڈاکٹر شازیہ، محولہ بالا، ص ۱۷۵
۱۱۵۔ احمد، اشفاق، ہلاکو کی لاشیں، بہ حوالہ: ''اشفاق احمد کی اردو شاعری''، محولہ بالا ص ۱۷۵
۱۱۶۔ اعظمی، فضا، بہ حوالہ: Lib.bazmeurdu.net/

Abstract

This article aims atgivinga detailed historical account of severe Bangal famine in 1943 and how it portrayed in Urdu poetry.In the beginning of the article, the brutal policies of British government towards the very region were discussed which led it to experience the worst kind of famine. It also explained that the financial motives were behind the British policies as it was dubbed Shonadesh (The Land of Gold).The article recorded many voices from Urdu poetry against the famine. The poets of Urdu used many genres for expressing their feelings the criticized the very disaster in their poetical accounts. The history and the poetry are on the same page to highlight the issue. The poets also depicted the sufferings of human being particularly women and children.

Keyword: Bangal, Urdu poetry, British policies.